اربابِ نثرِ اُردو

(از)

سید محمد ام۔ اے

فہرستِ مضامین

نشانِ سلسلہ		صفحہ

پیش نامہ

اب سے تقریباً ایک سو تیس برس قبل لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کے عہد حکومت میں فورٹ ولیم کالج کے ذریعہ ایک ایسی عظیم الشان ادبی تحریک عمل میں آئی جو تاریخ ادبیات اردو میں ایک نئے باب کا افتتاح کرتی ہے یہ عجیب اتفاق ہے کہ اسکاٹ لینڈ جیسے دور دراز ملک کا رہنے والا ایک معمولی طبیب جو نہ اہل زبان سے تھا نہ ادیب، اس کا محرک ہوا اس کے ہاتھوں ادبیات اردو کی ایک نہایت اہم صنف یعنی نثر کو ایسا رواج عام نصیب ہوا جو دکن، دہلی اور لکھنؤ میں اردو بولنے والوں کی کئی نسلیں گزرنے اور شعر و شاعری کے گوناگوں اسالیب پیدا ہو جانے کے باوجود بالکل جمود کی حالت میں تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے فورٹ ولیم کالج کو بالکل افادی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ نظمائے کمپنی کا اصل منشا کلکتہ میں چند ارباب قلم کو یکجا جمع کر کے ان سے اپنے انگریز اہلکاروں اور عہدہ داروں کے لیے ایسی سلیس درسی کتابیں لکھوانا تھا جن کا طرز بیان شاعرانہ نزاکتوں اور لفظی موشگافیوں کی بجائے سیدھا سادہ اور عام فہم ہو۔ اس کالج کے تقریباً تمام مصنفوں کو اس کا بہت ہی کم موقع دیا گیا کہ وہ قلم کی سحر کاریوں سے اپنے ذاتی جذبات و خیالات کی ترجمانی کرتے۔ کالج کے ارباب مقتدر کو ضروری کتب نصاب کی تیاری میں عجلت تھی اس لیے

ان مصنفوں سے بجائے مستقل کتابیں تصنیف کرانے کے مشہور و متداول اور بالخصوص فارسی کی عام پسند کتابوں کے ترجمے کرائے گئے۔

تاریخ اقوام میں اکثر بڑے بڑے نمایاں کاموں کی بنیاد چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ملتی ہے اور جس چیز سے بہت ہی کم توقع کی گئی تھی اُس سے نہایت شاندار ثمرات حاصل ہوئے ہیں۔ یہی حال اس تحریک کا بھی ہے اس کے علم برداروں کو شاید ہی یہ خیال ہوا ہو کہ ان کی اس حقیر کوشش میں درحقیقت ادبیات اردو کے ایسے تخم پوشیدہ ہیں جو ایک روز دلفریب اور زندۂ جاوید لٹریچر کی شکل میں بار آور ہونگے گذشتہ صدی اپنی روشن خیالی اور اعلیٰ علمیت کے اعتبار سے اس عہد سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے مگر اس میں ان مصنفین کے اسالیب بیان کی سادگی ولطافت، تخیّل کی بلندی و حیات افروزی کی مثالیں بہت کم ملینگی۔

نثر اردو کے ارباب ہندوستان کے کسی ایک صوبہ یا شہر کے باشندے نہیں تھے وہ ملک کے مختلف حصّوں کے رہنے والے تھے اور جیسا کہ ان کی تالیفات سے ظاہر ہے اپنے کارفرماؤں سے زیادہ جوش و انہماک کے ساتھ اپنے مفوضہ فرائض انجام دینے کے شائق تھے انھوں نے اپنے ذوقِ ادب اور اظہارِ کمال کے لیے نہ صرف قصص و حکایات کے میدان میں جولانیٔ قلم دکھائی علم و ادب کے مختلف شعبوں مثلاً تاریخ، قواعد زبان اور اخلاق و مذہب کی طرف بھی توجہ کی اور تالیفات کا ایسا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا جس کو عرصۂ دراز تک مقبولیتِ عام حاصل رہیگی۔

اِس کثیر ادب اور اس کے مولفوں کی ادبی زندگی پر تاریخی و تنقیدی نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس موضوع پر معتبر و مستند معلومات کا فقدان قدم قدم پر سدِّ راہ ہے اس وقت تک جو کچھ مواد

حاصل ہو سکتا ہے وہ کسی ایک مقام پر مجتمع نہیں - حیدرآباد میں تو اُس کے ملنے کی
بہت ہی کم توقع ہو سکتی ہے یہی وجوہ ہیں کہ اِس موضوع پر اب تک کسی نے
اہتمام کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا - اِن تمام مشکلات و موانعات کے باوجود اس
کتاب کے مولف سید محمد صاحب بی - اے نے بڑی ہمت سے اس دشوار کام کو
اپنے ہاتھ میں لیا اور ایسے زمانہ میں جبکہ وہ جامعہ کے امتحان یم - اے کی تیاری
میں مصروف تھے - اُن کی تحقیق و تلاش کے شاندار نتائج خود اُن کی مشکلات و
جانفشاں محنت کا اظہار کرتے ہیں اُن کی یہ تحقیقی تالیف اس لحاظ سے اور زیادہ
قابل قدر ہے کہ اِس خصوص میں اب تک کوئی ایسا کارنامہ اُردو یا انگریزی میں
موجود نہیں جو اُن کی رہنمائی کر سکے - مولفِ کتاب ہذا نے جن ابتدائی اُردو نثر
نویسوں پر کامیابی کے ساتھ قلم اٹھایا ہے اُن پر شاید ہی کسی نے سنجیدگی صحت و
تحقیق کے ساتھ روشنی ڈالنے کا خیال کیا ہو - راقم الحروف کو جہاں تک معلوم
ہے مولوی عبدالحق صاحب بی - اے معتمد انجمن ترقی اُردو کی تنہا سعی سے ایک مضمون
رسالہ اُردو اورنگ آباد میں اس موضوع پر شائع ہوا ہے یہ مضمون گو بظاہر
تحقیقاتی معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں برٹش میوزیم کی تفصیلی فہرستِ مطبوعات
و مخطوطاتِ اُردو مرتبہ بلوم ہارٹ کے منفرق بیانات کی صحافتی اُردو تشریح سے
زیادہ نہیں اس مضمون سے فورٹ ولیم کالج کے کارناموں کی حقیقی عظمت و اہمیت
پر کوئی نمایاں روشنی نہیں پڑتی - تحقیقی مواد کی اس بے مایگی کی حالت میں
سید محمد صاحب نے اپنا کام شروع کیا - انھیں اپنی تحقیقات کو ممکنہ طریقہ پر مکمل
کرنے کے لیے جگہ جگہ سے مواد فراہم کرنا اور متعدد تذکروں اور دیگر تالیفوں کی
ورق گردانی سے مصنفوں کے حالاتِ زندگی کا پتہ چلانا پڑا - انھوں نے نہ صرف
مختلف تذکروں سے جن میں تاریخی صحت کا بہت کم لحاظ رکھا گیا ہے اور جو

انفرادی طور پر مصنفوں کے علمی ارتقا و نشو و نما کے گوناگوں پہلوؤں پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہیں، مربوط و مسلسل معلومات جمع کی بلکہ تقریباً (۱۸) مصنفوں کی اکثر تالیفات کے قلمی نسخے فراہم کر کے بہ امعانِ نظر ان کا مطالعہ کیا اور ایک ایسا تحقیقی کارنامہ ترتیب دیا جو متعدد حیثیتوں سے مکمل ہے بعض قیمتی مخطوطات حیدرآباد اور شمالی ہند کے کتب خانوں میں دستیاب نہ ہو سکے، مولف نے اپنے احباب کے ذریعہ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس کے کتب خانوں سے ان کی نقلیں حاصل کیں۔ بہر طور اپنی تحقیقات کو ادھورا نہ چھوڑا۔

مولف نے اس کتاب کے ذریعہ اُردو دانوں کے آگے اپنی دو سالہ جانفشانی کاوش و تلاش کا ثمرہ پیش کیا ہے۔ اس میں تقریباً ہر ایک مصنف کے متعلق مبصرانہ تفصیل موجود ہے اگرچہ بعض حواشی درج ہونے سے رہ گئے اور کہیں کہیں تکرار بیان اور اصل بحث سے کسی قدر ہٹی ہوئی عبارتیں بھی نظر آتی ہیں مگر یہ کسی طرح اس کارنامہ کی اس حقیقی قدر و منزلت میں کمی نہیں کر سکتیں جو مولف کی مبصرانہ تحقیقات سے اس کو حاصل ہے۔ مولف نے جس تحقیق و تلاش سے منتشر مواد کو خوش اسلوبی سے جمع کیا اور اس پر تنقیدی نظر ڈالی ہے وہ ہر لحاظ سے قابلِ ستائش و لائق قدر ہے۔ اس کتاب کو لکھ کر مولف نے ادبیات اُردو میں تاریخی تحقیق و تدقیق کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔

سیّد عبد اللطیف

کلّیہ جامعہ عثمانیہ
یکم ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ

لے طبع دوم میں اس کی نظر ثانی کر دی گئی ہے۔

طبع دوم

ارباب نثرِ اُردو کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے تمام نسخے ختم ہو کر دو سال سے زیادہ عرصہ گزرا مگر میں اپنی کم فرصتی کی وجہ سے اس کی نظرِ ثانی اور دوسری اشاعت کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ بالآخر مہتمم صاحب مکتبہ ابراہیمیہ کے پیہم اصرار اور حسن توجہ سے اب یہ ایڈیشن اصلاح و ترمیم کے ساتھ اربابِ نظر کے آگے پیش کیا جاتا ہے۔ پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اس سلسلے میں جو مزید معلومات وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی رہی ان میں اپنی اپنی جگہ بڑھا دیا گیا ہے۔ بعض ابواب میں بھی رد و بدل کیا گیا ہے۔

اس تالیف کی ابتدائی ترتیب میں مجھے اپنے احباب مولوی عمر یافعی صاحب اور ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور ایم۔ اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ سے جو گراں قدر مدد ملی ہے اس کا ذکر کتاب میں جا بجا موجود ہے۔ یہاں بھی اس کا اعادہ کرتے ہوئے اس استفادے کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں جو مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب مولف دکن میں اُردو کی فراہم کردہ معلومات سے طبع دوم میں کیا گیا ہے۔

طبع اول کے موقع پر میرے محترم اساتذہ مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب بی ایس سی (لندن) سابق پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ، مولوی سید محمد اعظم صاحب ام۔اے بی ایس سی (کنٹب) پرنسپل گورنمنٹ سٹی کالج اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ایچ ڈی (لندن) سابق پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ نے جو قیمتی مشورے دیئے اور میری حوصلہ افزائی فرمائی میں اس کو فراموش نہیں کرسکتا۔

رحمٰن کاٹیج گھانسی بازار
حیدرآباد دکن
۱۶/ اپریل ۱۹۳۷ء

سید محمد

فورٹ ولیم کالج کے مؤلفین اور اُن کی تالیفات

(۳)

۱- میر امن دہلوی

۱- باغ و بہار
۲- گنج خوبی

۲- سید حیدر بخش حیدری

۱- قصۂ مہر و ماہ
۲- قصۂ لیلیٰ و مجنوں
۳- طوطا کہانی
۴- آرائش محفل
۵- ہفت پیکر
۶- تاریخ نادری
۷- گل مغفرت
۸- گلزار دانش
۹- گلدستۂ حیدری
۱۰- تذکرۂ گلشن ہند

۳- میر شیر علی افسوس دہلوی

۱- دیوان افسوس
۲- باغ اردو
۳- آرائش محفل

۴- میر بہادر علی حسینی

۱- نثر بے نظیر
۲- اخلاق ہندی
۳- تاریخ آسام
۴- رسالہ گل کرسٹ

۵- مرزا علی لطف

۱- کلیات لطف
۲- تذکرۂ گلشن ہند

۶- مولوی امانت اللہ

۱- ہدایت الاسلام عربی
۲- ہدایت الاسلام اردو
۳- ترجمۂ قرآن مجید
۴- جامع الاخلاق
۵- صرف اردو

۷- مظہر علی خاں ولا

۱- مادھونل اور کام کندلا
۲- ترجمۂ کریما
۳- ہفت گلشن
۴- اتالیق ہندی
۵- بیتال پچیسی
۶- تاریخ شیر شاہی

۷- جہانگیر نامہ

۸- مرزا جان طپش

۱- کلیات طپش

۲- شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان

۳- بہار دانش

۴- یوسف زلیخا

۹- مرزا کاظم علی جوان

۱- شکنتلا ناٹک

۲- بارہ ماسہ

۳- تاریخ فرشتہ

۱۰- شیخ حفیظ الدین احمد

۱- خرد افروز

۱۱- خلیل علی خاں اشک

۱- قصہ امیر حمزہ

۲- واقعات اکبر

۳- قصہ گلزار چین

۴- رسالہ کائنات

۱۲- مولوی اکرام علی

۱- اخوان الصفا

۱۳- نہال چند لاہوری

۱- مذہب عشق

۱۴- بینی نارائن جہاں

۱- چار گلشن

۲- دیوان جہاں

۳- تنبیہ الغافلین

۱۵- میر عبداللہ مسکین

۱- مرثیہائے مسکین

۱۶- للولال کوی

۱- پریم ساگر

۲- راج نیتی

۳- سبھا بلاس

۴- مہادیو بلاس

۵- لطائف ہندی

۶- سنگاسن بتیسی

۱۷- مرزا محمد فطرت

۱- عہد نامہ جدید (انجیل)

۱۸- محی الدین فیض

۱- چشمۂ فیض

۱۹- سید حمید الدین بہاری

۱- خوان الوان

اردو نثر فورٹ ولیم کالج سے پہلے

ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان اُردو کی بنیاد اس وقت پڑی جب کہ مسلمان فاتحوں نے کوہ ہندوکش کو عبور کر کے سرزمین ہند میں قدم رکھا اور آریہ ورتھ کے باشندوں سے میل جول قایم کیا۔ جوں جوں ان دونوں قوموں کے تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی مسلمانوں کی عربی فارسی اور ہندوستان کی آریائی زبانوں کے باہمی ملاپ سے ایک مخلوط زبان یعنے اُردو عالم وجود میں آئی ابتداءً سوداسلف لین دین اور دین و مذہب کی ضروریات کے الفاظ کا ذخیرہ فراہم ہوا اور یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے آج اُردو نے دنیا کی دیگر السنہ کی طرح ایک ممتاز زبان کی حیثیت حاصل کرلی اور قوی امید ہے کہ اس دور تمدن میں اس کی ترقی و وسعت کے جو ذرایع پیدا ہو گئے ہیں ان سے یہ زبان حقیقی معنوں میں دنیا کی ایک مشہور اور وسیع زبان بن جائیگی۔

اگرچہ اُردو کی بنیاد پڑے زمانہ دراز گذر چکا تھا لیکن اس میں علم و ادب کی

کتابیں بالکل نہ تھیں اور وہ صرف تقریری زبان تھی۔ مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے زمانہ میں شعر و شاعری تو شروع ہو گئی مگر جہاں تک کتب نثر کا تعلق ہے اُردو کا دامن نہایت ہی تنگ اور محدود تھا۔ ادبیات اُردو کی اس زبردست تحریک سے قبل شمالی ہند میں تو نثری کتابیں اس قدر کم تعداد میں لکھی گئیں کہ ان کا عدم و وجود برابر ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ شمالی ہند میں اُردو نثر نویسی منظم و مربوط طور پر سب سے پہلے اسی کالج کی طرف سے عمل میں آئی البتہ دکن کی سرزمین اس سے مستثنیٰ ہے اُردو نظم کی طرح اُردو نثر کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا ہے۔ اگرچہ اُردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ تاہم اس وقت تک جو تحقیقات ہوئی ہے اور دکنی اہل قلم کی جو کتابیں دریافت ہوئی ہیں ان سے یہ امر صاف طور پر ثابت ہے کہ شمالی ہند میں نثر نویسی کے شروع ہونے سے کئی سو سال قبل اس ملک میں اُردو زبان کی نہ صرف داغ بیل پڑ چکی تھی بلکہ اس میں نظم و نثر کے بار آور درخت بھی موجود تھے گو زمانہ دراز تک اُردو زبان کی ترقی کے باوجود عام خاص لوگ فارسی ہی لکھنا پسند کرتے تھے اور اُردو نثر لکھنے کو عیب سمجھتے یا ایسے کمالی سے تعبیر کرتے تھے حتیٰ کہ نجی کے خطوط، دواساز کے نسخے اور گھر کا حساب تک بھی فارسی میں لکھتے تھے مگر اہل دکن نے شمالی ہند کے برخلاف اردو کی طرف بہت جلد توجہ کی اور جو چیز شمالی ہند والوں نے صدیوں کے بعد شروع کی اس کو اہل دکن نے عرصہ دراز پہلے ترقی کے زینہ پر پہنچا دیا تھا۔

اردوئے قدیم[1] کی بعض تحقیقات نے حضرت شیخ عین الدین گنج العلم جنیدی

---

[1] اردوئے قدیم از حکیم شمس اللہ صاحب قادری

۹۵ھ کے دکنی رسائل کو جن کا ایک مجموعہ قلعہ سنٹ جارج کے کتب خانہ میں بتایا جاتا ہے اردو کی قدیم ترین مصنفات قرار دیا ہے اس کے بعد کی دوسری کتاب حضرت خواجہ بندہ نواز کی "معراج العاشقین" ہے آپ کا زمانۂ حیات سنہ ۲۰ تا ۸۲۵ھ ہے آپ کے صاحبزادے کا بھی ایک نثر و نظم کا رسالہ ہمارے ایک دوست کو دستیاب ہوا ہے نیز آپ کے نواسے سید محمد عبداللہ حسینی نے حضرت غوث اعظم سید عبدالقادر جیلانی رض کے رسالہ "نشاط العشق" کو دکھنی میں ترجمہ کیا ہے یہ تمام کتابیں قدیم ترین دکھنی مصنفات ہیں اور ان میں سے تقریباً تمام مذہبی تعلیم و تبلیغ کی بدولت وجود میں آئی ہیں ابتداً ان ہی بزرگان دین نے عوام الناس کو جن کی عام بول چال کی زبان دکھنی یا قدیم اردو تھی، احکام و مسائل دین سکھانے اور تصوف و معرفت کے نکات بتانے کے لیے اس میں تصنیف و تالیف شروع کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو زبان میں سب سے پہلے مذہبی الفاظ و اصطلاحات کا ذخیرہ فراہم ہوگیا اس کے بعد نویں اور دسویں صدی ہجری میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کا بھی بڑا حصہ مذہبی کتابوں ہی پر مشتمل ہے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق متوفی سنہ ۹۰۲ھ کی شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ، اور گل باس، آپ کے فرزند حضرت شاہ برہان الدین جانم کی مولفات، مولانا عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ (سنہ ۱۰۲۳ھ)، حضرت میراں یعقوب کی شمائل الاتقیا (سنہ ۱۰۸۰ھ)، سید شاہ محمد قادری کے رسائل اور سید شاہ میر کا رسالہ اسرار توحید وغیرہ سب مذہبی کتابیں ہیں اس زمانہ میں جہاں تک موجودہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے چند ہی کتابیں غیر مذہبی

ہٹ کر لکھی گئیں اور ان میں بھی مذہب کا عنصر غالب ہے ایسی کتابوں میں ایک مولانا وجہی کی کتاب "سب رس" ہے جو ۱۰۴۴ھ میں تالیف ہوئی اگرچہ یہ ایک قصہ ہے لیکن مصنف نے جابجا مذہبی امور سے بحث کی ہے اور صفحے کے صفحے اس موضوع کی نذر کر دیے ہیں غرض اس زمانہ قدیم میں جو کچھ لٹریچر پیدا ہوا وہ مذہب کی بدولت تھا اور اس ابتدائی دور میں اس کا دامن صرف مذہب تک محدود رہا۔ جب ذرا ترقی ہوی تو قصص و حکایات کا ذخیرہ فراہم ہونے لگا اور اردو زبان اس صنف ادب سے آشنا ہوی۔ ان کتابوں اور اس دور پر تفصیلی بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دکن میں اردو نثر نویسی اور ادب کے بعض شعبوں میں اچھی خاصی ترقی ہو چکی تھی۔

ظاہر ہے کہ ہر چیز آغاز کے وقت نہایت سادہ اور بے تکلف ہوتی ہے یہ خصوصیت ہر زبان اور ادب میں پائی جاتی ہے۔ دکھنی الفاظ سے قطع نظر اس ابتدائی دور کی نثری پیداوار سادگی اور بے تکلفی کے زیور سے آراستہ تھی۔ چونکہ اس کی بنیاد عوام الناس کے افادہ پر رکھی گئی تھی اور ابتدائی موفین کے پیش نظر فارسی کی ترقی یافتہ اور پر تکلف نثر کی بجائے قدمائے ایران کے سادہ و سلیس نثری کارنامے تھے اس لیے ابتدا ہی سے صفائی و سادگی کا خیال رکھا گیا۔ عبارت میں تصنع و تعقید نہیں۔ الفاظ کے ذریعہ زینت کلام مقصود نہیں جو کچھ بیان کرنا ہے حتی الوسع صاف صاف عبارت میں بیان کر دیا گیا ہے تاہم مرور زمانہ اور زبان کی تدریجی ترقی اور تبدیلیوں کی وجہ سے آج کل اس زمانہ کی تحریریں دقیق ہیں

---

[1] اس کتاب کو مولوی عبدالحق صاحب نے مرتب کر کے شایع بھی کیا ہے۔

گنجلک نظر آتا ہے۔

شمالی ہند کی نثری پیداوار کا آغاز مولانا فضلی کی وہ مجلس سے قرار دیا جاتا ہے جو ۱۱۴۵ھ کی تالیف ہے بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا فضلی ہی شمالی[1] ہند میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو نثر نویسی پر قلم اٹھایا ہے اسی بنا پر اب تک بھی بعض لوگ انہی کو اردو کا پہلا نثر نویس سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ شمالی ہند دکن کی ادبی سرگرمیوں سے بہت بڑی حد تک بے خبر تھا۔ ذرائع آمد ورفت کی قلت اور بُعد مسافت کی وجہ سے اہل دکن کی علمی ترقیاں اور ان کے ادبی کارنامے کوہ بندھیاچل کے آگے نہ جاسکے۔ نظم سے جو عام وابستگی رہی ہے اس کی وجہ سے شعرائے دکن کا کچھ نہ کچھ کلام وقتاً فوقتاً شمالی ہند والوں کی بھی ضیافت طبع کرتا رہا۔ مگر اہل دکن کی نثر سے شمالی ہند کو واقف ہونے کا موقع ہی نہ ملا چنانچہ مولانا فضلی نے اپنی نثر نویسی کو ایک ایجاد اور اختراع سے تعبیر کیا ہے اور ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل، اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل۔ کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے۔ اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے۔ لہذا کوئی اس صنف کا نہ ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نہیں ہوا مستمع" مولانا فضلی کے بعد مرزا سودا کا نثری دیباچۂ کلیات اور مثنوی شعلۂ عشق کا خلاصہ اور پھر محمد حسین کلیم کا ترجمہ فصوص الحکم، حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کا ترجمۃ القرآن وغیرہ چند نثری کتابیں ہیں اس سلسلہ کی آخری کڑی عطا حسین خاں تحسین کی

---

[1] ان کے شمالی ہند کے باشندہ ہونے میں بھی بعض تذکرہ نویسوں کو تامل ہے۔

"نوطرز مرصع" ہے اور اس پر یہ فہرست ختم ہوجاتی ہے ان کتابوں کا تعلق بھی مذہب اور قصص و حکایات سے ہے۔ تاریخ، سوانح عمری، اخلاق و معاشرت وغیرہ سنجیدہ موضوعات پر ایک بھی کتاب نہیں لکھی گئی۔

زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے بھی ان کتابوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ان کی بنیاد زیادہ تر فارسی کی آراستہ و پر تکلف عبارتوں پر رکھی گئی تھی اور فارسی کی تقلید میں نہ صرف عربی فارسی الفاظ کی کثرت ہے بلکہ جا بجا قافیوں کی پابندی بھی کی جاتی ہے، صرف فعل و حرف ربط وغیرہ چند الفاظ اردو کے ہیں اور باقی سارے الفاظ فارسی کے۔ فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو کے نثری کارناموں کا جو سرمایہ ہے اس کی یہ حقیقت ہے۔ آئندہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرمائینگے کہ اس کالج نے نثر اردو کی عمارت کی نیو کس طرح ڈالی اور نثر نویسی کی کیسی اساسی تحریک کی کہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اردو زبان میں تصنیف و تالیف کے لیے وسیع ترین میدان کھل گیا۔ اور اردو نثر کی شاندار عمارت چنی جانے لگی۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے میں سب سے زیادہ حصہ گل کرسٹ نے لیا ہے ان کی کوششوں نے اردو کے قالب میں ایک نئی روح پھونک دی فورٹ ولیم کالج کی طرف سے جو کتابیں مرتب اور شائع ہوئی ہیں وہ عام طور پر صرف قصے کہانیوں تک محدود سمجھی جاتی ہیں مگر یہ ایک غلط خیال ہے۔ اگر کمپنی کے ارباب مقتدر، لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی تجویز پر خاطر خواہ توجہ کرتے تو یقیناً اردو زبان میں تاریخ و حکمت اور دیگر علوم کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہوجاتا۔ عقلائے کمپنی کی

تنگ نظری اور اپنی تنگ دامنی کے باوجود بھی اس کالج نے تاریخ تذکرہ اور انتخابات
دواوین کا اچھا خاصا ذخیرہ مرتب کردیا اور اس کو ملک میں عام طور پر رائج
کرنے کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر طباعت کا اہتمام بھی کیا۔ آج ہندوستان میں پتھر کے
چھاپہ سے روز بروز زیادہ بیزاری ظاہر کی جا رہی ہے، ارباب کالج نے
اس زمانے میں باوجود متعدد دقتوں کے ٹائپ کی طباعت کا اہتمام کیا تھا
کالج کی اکثر کتابیں اسی خوشنما ٹائپ میں چھپی ہوئی اب بھی موجود ہیں۔
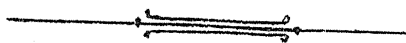
فورٹ ولیم کالج

تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب حقیقت سے سب واقف ہیں
کہ انگریز اس ملک میں تجارت کے بہانے داخل ہوئے اور رفتہ رفتہ
ملک گیری اور تسخیر سلطنت شروع کر دی۔ ملک کے حالات نے اُن کی
مساعدت کی۔ مرکزی حکومت مغلیہ کی کمزوری اور صوبہ داروں اور
راجاؤں کے آپس کے نفاق نے بہت جلد ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان
پر حکمراں بنا دیا اور تھوڑے ہی دنوں میں کمپنی کی کوٹھیاں جو محض تجارتی
اغراض اور اپنے مال و اسباب کی حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں قلعوں
سے بدل گئیں اور ان میں بجائے حفاظتی دستوں کے یورپی اور دیسی فوجیں
اسباب جنگ و اسلحہ سے لیس رہنے لگیں اور کمپنی تجارت اور لین دین کے
ساتھ جہانبانی و حکمرانی بھی کرنے لگی۔ ابتدا ہی سے کمپنی کو تجارتی اور حکومتی
اغراض کے لیے اپنے یورپی ملازمین کو ہندوستان کی زبان، رسم و رواج

اور طور طریقوں سے واقف کرانا پڑا اس ضرورت کے مدنظر کمپنی کے نظماء متعدد طریقوں پر وقتاً فوقتاً اپنے انگریز ملازمین کو یہاں کی دیسی زبانیں سکھانے کا انتظام کرتے رہے اور جوں جوں ان کا دائرہ عمل بڑھتا گیا، اس میں بھی ترقی و اضافہ کرنا پڑا۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ اُردو زبان کی ترقی میں ایک ایسی قوم کو حصہ لینا پڑا جو اہل زبان یعنی ہندوستانیوں سے صورت شکل، رنگ، لباس، وضع قطع، اور رسم و رواج ہر حیثیت سے جدا تھی۔ یہی قوم جس نے اہل ہند کے ہاتھوں سے ہندوستان کی حکومت چھین لی اور خود اس کی مالک بن بیٹھی، ان کی زبان کی ترقی کا باعث ہوی۔ اسی قوم کی بروقت توجہ نے اہل ہند کی عام زبان یعنے اردو کی پرورش کی۔ اور اپنی مسیحا نفسی سے اس کے قالب مردہ میں جان ڈال دی۔ وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل اول سے لے کر لارڈ ویلزلی تک ہر ایک انگریز حاکم اپنے اپنے عہد میں کمپنی کے انگریز ملازمین کو دیسی زبانیں سکھانے کے لیے کچھ نہ کچھ انتظام کرتا رہا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہو سکا ہے اس خصوص میں سب سے پہلی منظم کوشش وارن ہیسٹنگز کی ہے۔ اس گورنر جنرل نے کلکتے کے انگریزی علاقے میں ایک مدرسہ قایم کیا۔ یہ دیسی کالج کہلاتا تھا اور اس میں زیادہ تر فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور انگریزوں کے علاوہ ہندوستانی طلبا بھی تعلیم پا سکتے تھے یہاں اُردو یا دیگر ملکی السنہ کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا۔

عموماً کمپنی کے ملازمین خانگی طور پر اُردو نوشت و خواند کی مہارت پیدا کر کے اس کالج میں شریک ہو جاتے اور ایک دو سال میں کچھ ٹوٹی پھوٹی فارسی پڑھنے کے قابل ہو جاتے تھے۔ اس کالج کا دائرہ عمل نہایت ہی محدود تھا اور کمپنی کی ضروریات کے لیے بالکل ناکافی تھا۔

۱۷۹۸ء میں لارڈ ویلزلی ارل آف مارنگٹن گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔ یہ نہایت اولعزم اور مدبر گورنر جنرل تھے۔ اور اس عہدہ پر فائز ہونے سے قبل انگلستان میں کمپنی کی مجلس نظم و نسق کے رکن بھی رہ چکے تھے انھوں نے ہندوستان آتے ہی کمپنی کے کاروبار پر نظر غائر ڈال کر سب سے پہلے ملازمین کمپنی کو اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دلانے کی ضرورت محسوس کی اور ایک طویل و مدلل یادداشت لکھ کر نظمائے کمپنی سے ایک کالج قائم کرنے کی اجازت چاہی اور اپنے غیر معمولی تدبر سے کام لے کر اس کے مصارف کے لیے نئی نئی راہیں سوچیں۔ پھر زیادہ دنوں تک کارروائی کو طول دیے بغیر ۴ مئی ۱۸۰۰ء کو کالج کا افتتاح بھی کر دیا۔ یہی فورٹ ولیم کالج ہے۔ اس کے قیام سے پہلے اُردو کی تعلیم کا عملاً کوئی باضابطہ انتظام نہ تھا۔ اور کمپنی کے انگریز ملازم جو دیوانی، فوجداری اور دیگر اعلیٰ خدمتوں پر مقرر ہوتے تھے اپنے طور پر اُردو کی تحصیل کیا کرتے تھے کمپنی ان کو تیس روپے فی کس الونس خاص تحصیل زبان فارسی کے لیے دیا کرتی تھی۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے جو اردو کے اچھے عالم اور اس کے بڑے محسن و سرپرست تھے خانگی طور پر یہ انتظام کیا کہ اپنے فرائض خدمت کے علاوہ ملازمین کمپنی کو

اُردو کی تعلیم دیا کریں۔ اس غرض سے انھوں نے اپنی ایک درس گاہ بھی قائم
کی تھی اور ملازمین کمپنی کو اُردو نوشت و خواند میں ماہر بنا کر فارسی کی تعلیم کے
لیے فارسی داں ہندوستانیوں کے سپرد کرتے تھے آخر میں خود بھی اس کا
انتظام کرنے پر آمادہ ہوگئے اور اُس کے لیے الونس تحصیل زبان کے
سوا کوئی اور معاوضہ نہ چاہا۔ عموماً کمپنی کے انگریز ملازمین نوعمر ہوتے تھے۔
انگلستان میں بھی اُن کی تعلیم اعلیٰ درجہ کی اور خاطر خواہ نہ ہوئی تھی اس لحاظ
سے یہ لوگ حقیقی معنوں میں کار داں اور اہل ثابت نہ ہو سکتے تھے اسی
بنا پر لارڈ ویلزلی نے کالج کی جو تجویز پیش کی تھی اس میں ایشیائی زبانوں
مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، اُردو، بنگالی اور مرہٹی کے علاوہ یورپی
زبانوں میں لاطینی، یونانی اور انگریزی اور علوم و فنون میں تاریخ عمومی،
تاریخ ہند قدیم و جدید، تاریخ دکن، اصول قانون، شرع شریف،
دھرم شاستر، جغرافیہ شمالی ہند و دکن وغیرہ کی تعلیم کا انتظام چاہا تھا۔
کمپنی کے نظما اپنی تجارت کو فروغ دینا اور زیادہ سے زیادہ منفعت
حاصل کرنا تو چاہتے تھے مگر وہ اس عظیم الشان کالج کے مصارف کثیر کا نام
سن کر کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ علاوہ ازیں لارڈ ویلزلی نے ملک گیری اور
لشکر کشی میں کمپنی کا بہت سا روپیہ صرف کر دیا تھا اور نظمائے کمپنی ان کی
اس دریا دلی سے سخت خائف تھے گورنر جنرل کے بار بار کے اصرار پر
کالج قائم کرنے کی منظوری دی مگر اس کو بجائے علم و فن کی عظیم الشان
درس گاہ کے صرف مشرقی السنہ کا کالج قرار دیا۔ جب گورنر جنرل نے

مزید کوشش کی تو کالج ہی کی برخاست کے احکام نافذ کر دیئے مگر پھر گورنر جنرل نے حکمت عملی سے اُن کے اس حکم کی نظر ثانی کرائی - اور بہت کچھ تخفیف مصارف کے ساتھ اس کالج کو برقرار رکھا -

لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنے تدبر و دانشمندی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب فارسی ہندوستان کی زبان نہیں رہی اور یہاں کی ملکی زبانوں میں صرف ہندوستانی یعنے اُردو ہی ایک ایسی بسیط زبان ہے جو ملک کے بہت بڑے حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس حقیقت کے معلوم ہو جانے کے بعد دوسرا کام اس زبان کی ادبیات فراہم کرنے کا تھا - اُردو کا سارا ذخیرہ صرف شعر و شاعری تک محدود تھا نثر سرے سے مفقود تھی اور تاریخ و جغرافیہ وغیرہ علوم کی کتابیں موجود ہی نہ تھیں - اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ایک سررشتہ تالیف و تراجم قایم کیا گیا - اور اطراف ملک سے قابل افراد کو چن کر کلکتے میں ایک جا جمع کیا گیا اور ان سے اُردو نثر میں کتابیں لکھوائی جانے لگیں - تالیف و تراجم کا دفتر قایم کرنے کے بعد دوسری غور طلب بحث یہ پیش آئی کہ آیا قصص و حکایات، تاریخ و تمدن کی کتابیں از سر نو اُردو میں تصنیف کرائی جائیں یا فارسی اور سنسکرت و ذخیرہ السنہ قدیمہ میں جو ذخیرہ ان مضامین کا پہلے سے موجود اور عام طور پر ہندوستان میں مقبول ہے اس کو اُردو میں منتقل کر لیا جائے - آخر الذکر صورت بہ لحاظ حالات و قرائن سہل اور زیادہ کارآمد تھی - اس

طریقہ پر تھوڑے ہی دنوں میں فارسی کا کافی ذخیرہ ادب اردو میں منتقل ہوسکتا
تھا یہی طریقہ سلامت روی کا ہے اور تقریباً ہر زبان میں تصنیف تالیف
کے پیش رو ایسا ہی کرتے رہے ہیں عربوں نے پہلے یونانی علوم و فنون کی
چوٹی کی کتابیں اپنی زبان میں منتقل کرلیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کی روشنی
میں اعلیٰ تصانیف پیش کرنے کے قابل ہوگئے ۔ فورٹ ولیم کالج کے
کئی سال بعد ہندوستان کے مجدد تعلیم سر سید رح نے بھی یہ ضرورت
محسوس کی اور سائنٹیفک سوسائٹی قائم کرکے ہر علم و فن کی اعلیٰ کتابیں
اردو میں ترجمہ کرانے لگے ۔ جامعۂ عثمانیہ بھی اسی اصول پر کاربند ہے
اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ نے
اس راز کو پاکر قیام جامعہ کے ساتھ ہی سررشتہ تالیف و تراجم قایم
فرمایا، جو مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ ترین کتابوں کو اردو میں منتقل کررہا ہے
رفتار زمانہ کے مد نظر جیسا کہ ہمارے جامعہ کے مدبر امیر جامعہ نے اپنے
خطبۂ صدارت[1] میں ارشاد فرمایا تھا ضرورت ہے کہ اس کام کو صرف
دار الترجمہ ہی پر نہ چھوڑا جائے بلکہ ہر ممکنہ طریقے سے دنیا کی ترقی یافتہ
زبانوں کے علوم و فنون کا ذخیرہ جلد سے جلد اردو میں فراہم کرلیا جائے
چونکہ نظمائے کمپنی نے لارڈ ویلزلی کی اصل تجویز میں ترمیم و تبدیل کرکے
کالج کو صرف السنہ مشرقیہ اور بالخصوص اردو فارسی اور بنگالی کی تعلیم تک
محدود کردیا تھا اس لیے جو لٹریچر اس کالج کے اہل قلم نے تیار کیا

---

[1] خطبۂ عالیجناب سر مہاراجہ بہادر امیر جامعہ ص ۱۹ بہ تقریب جلسہ عطائے اسناد بابتہ ۱۳۴۳ف

اس کا بڑا حصہ اخلاقی اور افسانوی کتابوں کا ہے اور اس سے کسی قدر کم حصہ تاریخی کتابوں کا ہے۔ دیگر علوم و فنون کی کتابیں بہت کم تیار ہوئیں۔ کالج کی پروفیسریوں پر عموماً دیسی علما کو مامور نہیں کیا گیا۔ بلکہ انھیں منشی یا پنڈت کا لقب دے کر درس و تدریس کے ساتھ تعلیم و ترجمہ کا کام لیا جانے لگا۔ یہ دیسی عالم انگریز پروفیسروں کے ماتحت دونوں فرائض انجام دیتے رہے۔ کالج کے قوانین اس طرح کے سخت تھے کہ غیر عیسائی شخص کو ذمہ دارانہ خدمت نہیں دی جاتی تھی۔ قیام کالج کے ساتھ ہی ڈاکٹر گلکرسٹ اس کے صدر اور اردو کے پروفیسر مقرر کیے گئے۔ وہ اس عہدے پر صرف چار سال تک فائز رہے مگر اس قلیل مدت میں ان کی مساعی سے بہت کچھ تصنیف و تالیف کا کام انجام پایا اور ان کے جانشینوں نے کئی سال میں جو کام انجام دیا ہے وہ ان کے کام کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں۔ کالج گو براہِ راست دینِ مسیحی کی تبلیغ نہیں کرتا تھا مگر بالواسطہ اس مذہب کی اشاعت کا کام بھی اس سے لیا گیا اور انجیل کا بھی اردو میں ترجمہ کرایا گیا۔ ڈاکٹر گلکرسٹ نے اردو ادب کے افہام و تفہیم کے لیے اسلامیات سے واقف ہونے کی جو ضرورت ہے اس کے مدِ نظر قرآن مجید کا بھی اردو میں ترجمہ کرانا شروع کیا تھا مگر بعد کو ان کے جانشینوں نے یہ کام بالکل موقوف کرا دیا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد بھی جو انگریز اس کالج کی صدارت اور دیگر

انتظامی عہدوں پر فائز ہوئے وہ اکثر و بیشتر اردو کی سرپرستی اور اہل یورپ میں اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیتے رہے۔ یہ کالج عروج و زوال کے مدارج طے کرتا ہوا تقریباً کمپنی کے خاتمے اور ہندوستان پر حکومت برطانیہ کے تسلط تک جاری رہا۔ اس کی تالیفات و تراجم کمپنی کے دیگر مدارس میں اور عام ہندوستانیوں کے نزدیک مقبول ہوئے اور ملک میں ان کو رواج عام حاصل ہوگیا۔

بلاشبہ ڈاکٹر جان گل کرسٹ اُردو کے ان چند مخصوص محسنوں اور سرپرستوں میں سے ہیں جن کے بارِ احسان سے اُردو زبان کبھی سبکدوش نہ ہوگی۔ رہتی دنیا تک اُردو کے محسنوں میں ان کا نام باقی رہیگا۔ یہ انہی کی مسیحا نفسی تھی کہ اُردو نثر کے قالبِ مردہ میں جان پڑ گئی اور اُردو زبان نثر کی متعدد کتابوں سے مالا مال ہوگئی۔ اگر وہ اُردو نثر نویسی کی طرف متوجہ نہ ہوتے اور اہل زبان کو اُن کے خواب غفلت سے بیدار نہ کرتے تو شاید ایک عرصہ تک اُردو نثر اُسی عالم جمود میں رہتی جو اُن کی مساعی شروع ہونے سے قبل اس پر طاری تھا۔ یہ فقط اسی مشرق پسند انگریز کا طفیل ہے کہ اردو زبان میں نثر نویسی کو رواج عام نصیب ہوا اور جس عمارت کی بنیاد اس کے مبارک ہاتھوں نے رکھی تھی آج وہ سربفلک بن گئی ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اُردو زبان کی وسعت کی ایسی نئی راہیں

نکالیں کہ متاخر اہل قلم ان راہوں پر چل کر اپنی جولانی قلم سے نہایت نمایاں اور درخشندہ کارنامے اپنی یادگار چھوڑ گئے اور چند ہی روز میں اردو جیسی کم سرمایہ زبان کو جس میں خط و کتابت کرنا بھی ثقہ لوگ معیوب سمجھتے تھے اس قابل بنا دیا کہ وہ سارے ہندوستان کی مشترکہ اور ایشیا کی ایک وسیع زبان بن گئی اور ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک اسی زبان میں علم و فن کی کتابیں لکھی جانے لگیں۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کے حالات زندگی سے اردو کے تمام تذکرے خالی ہیں البتہ انگریزی کتابوں اور فورٹ ولیم کالج کی تاریخوں اور دیگر سرکاری کاغذوں میں اُن کے جستہ جستہ حالات بیان کیے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہم کو بعض ایسی کتابیں نہ مل سکیں جن سے اُن کے حالات پر خاطر خواہ روشنی پڑنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ جو کچھ مواد فی الوقت دستیاب ہو سکا اس سے مندرجۂ ذیل معلومات پیش کی جاتی ہیں۔

ان کا پورا نام جان بارتھ وک گل کرسٹ ہے۔ ان کی ولادت ۱۷۵۹ء میں اسکاچستان (اسکاٹ لینڈ) کے پایۂ تخت اڈنبرا میں ہوئی ابتدائی تعلیم اسی شہر کے مدارس میں پائی۔ نوشت و خواند کی صلاحیت پیدا کرنے کے بعد طب کی تحصیل کا شوق ہوا اور اڈنبرا کی مشہور طبی درسگاہ میں جو "جارج ہیریٹ ہسپتال" کے نام سے موسوم تھی شریک ہوئے اور اس فن شریف کی تکمیل اسی درسگاہ میں کی۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار روز بروز ترقی پر تھے اور انگلستان و اسکاچستان کے

نوجوان تعلیم یافتہ مختلف عہدوں پر مامور کرکے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ بھی طبی تعلیم سے فراغت پا کر ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے خواہاں ہوئے۔ کمپنی کے عہدہ داروں نے ان کی مستعدی و اعلیٰ قابلیت کے مدِنظر ۱۷۸۲ء میں ان کو طبی عہدہ دار مقرر کیا اور یہ بمبئی پہنچے۔ جہاں سے ایک سال کے بعد کلکتہ بھیجے گئے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے جیسا کہ وہ اپنی لغت کے دیباچے میں لکھتے ہیں، ہندوستان آنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ جب تک میں اس ملک کے باشندوں کی عام زبان سے کماحقہ واقف نہ ہو جاؤں نہ میں اپنے فرائض خدمت خاطر خواہ طریقے پر انجام دے سکتا ہوں نہ خود مجھے اس ملک میں زندگی بسر کرنے میں لطف ملیگا۔ انہوں نے بمبئی ہی میں اُردو زبان کو ہندوستان کی عام زبان ہونے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں بول چال کے لیے یکساں طور پر رائج ہونے کی وجہ سے سیکھنا شروع کیا اور دو تین سال میں سخت محنت اور کوشش سے اس قدر استعداد بہم پہنچائی کہ اوائل ۱۷۸۵ء میں، سر جان میکفرسن نے جو وارن ہیسٹنگز کی جگہ منصرم گورنر جنرل تھے، انہیں تحصیل و تحقیق زبان اُردو کے لیے خاص طور پر طویل رخصت دینا منظور کر لیا۔ یہ اپریل ۱۷۸۵ء میں ہی کلکتے سے نکل کر فیض آباد پہنچے اور ہندوستانیوں کی معاشرت اختیار کرکے بالکل ہندوستانی بنے ہوئے ہمہ تن اُردو زبان کے تحقیقی مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ہندوستان کے بعض مشہور شہروں جیسے

دہلی بنارس اور لکھنو وغیرہ کا بھی دورہ کیا اور ہندو مسلمان پنڈتوں اور
منشیوں کی مدد سے نہ صرف خود اُردو کے ماہر زبان دان بن گئے بلکہ
السنہ مشرقیہ اور بالخصوص اُردو کے ساتھ ان کو ایسا شغف ہو گیا کہ
اپنی تمام عمر اسی زبان کی تحقیق، توسیع و اشاعت میں صرف کر دی۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے ہندوستان کی مختلف زبانوں پر ناقدانہ نظر
ڈال کر ارباب مقتدر کو مطلع کیا کہ اب فارسی ہندوستان کے باشندوں کی
زبان نہیں رہی۔ مسلمانوں کی حکومت کا دائرہ رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ جو علاقے
کمپنی کے تصرف میں ہیں ان میں فارسی کو دفتری زبان کی حیثیت سے برقرار رکھنے کی
چنداں ضرورت نہیں دیگر ملکی السنہ میں صرف اُردو یا ہندوستانی کا دائرہ عمل نہایت
وسیع ہے اور ضرورت ہے کہ اس عام بول چال کی زبان کی تحصیل کی جائے۔ ابتداءً ان کی اس
معقول تحریک پر جیسی چاہئے توجہ نہیں کی گئی مگر بعد ازاں یورپی ماہرین السنہ نے
متفقہ طور پر اُن کی رائے قبول کر لی ۱۸۳۲ء میں اُردو سرکاری زبان
قرار پائی۔ اگرچہ اس وقت ڈاکٹر گل کرسٹ کمپنی کی ملازمت سے سبکدوش
ہو کر اپنے وطن مالوف کو واپس ہو چکے تھے، مگر اُن کی اصابت رائے
کمپنی کی مالی و ملکی ترقیات میں بہت مفید ثابت ہوئی۔ اور کمپنی کو نہایت
عمدگی سے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرنے اور عوام کا اطمینان و
دلبستگی حاصل کرنے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے مشرقی زبانوں میں مہارت حاصل کرتے ہی
تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا اور اپنے ہم قوموں کو اردو زبان

سکھانے کے لیے سب سے پہلے جن فنون کی ضرورت تھی مثلاً قواعد زبان۔ اور لغت وغیرہ اُن پر کتابیں لکھیں۔ کمپنی کے دوسرے یورپی ملازمین کو تعلیم دینے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اُن کو روزانہ اُردو کے درس دیا کریں گے، تاکہ یہ ملازمین اُردو میں نوشت وخواند کی صلاحیت پیدا کر کے فارسی کی تحصیل کے قابل ہوجائیں۔ خود بھی فارسی پڑھانے کا اہتمام کیا اور اس کے لیے تحصیل زبان کے الونس کے سوا کوئی اور معاوضہ نہیں چاہا۔ ان کی اس تجویز کو لارڈ ویلزلی گورنر جنرل نے جو خود بھی السنۂ مشرقیہ کے حامی و ہمدرد اور فورٹ ولیم کالج کے بانی تھے کونسل کے اجلاس میں بے حد پسند کیا۔

۱۷۹۸ء میں جب لارڈ ویلزلی گورنر جنرل کے عہدہ پر فائز ہوکر ہندوستان آئے تو جیسا کہ اُوپر بیان کیا جاچکا ہے انہوں نے سب سے پہلے کمپنی کے ملازمین کے لیے اعلیٰ پیمانہ پر ایک کالج قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ کالج کے قیام کے لیے نظمائے کمپنی سے مراسلت کرنے لگے۔ کمپنی کے نظما کو اپنی تجارت کو ترقی دینا اور زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا تو مقصود تھا لیکن وہ کالج کے قیام کے مصارف برداشت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ گورنر جنرل کی متواتر کوششوں پر ۱۸۰۰ء میں ان کی اصل تجویز میں بہت کچھ تخفیف و ترمیم کر کے فورٹ ولیم کالج قائم کرنے کی منظوری دی۔ گورنر جنرل نے اس کالج کی صدارت کے لیے سب سے زیادہ موزوں ڈاکٹر گلکرسٹ کو پایا اور ان کی اُردو دانی

اور علمی خدمات کے مدِنظر صدر مقرر کیا ڈاکٹر گل کرسٹ اس عہدہ پر کچھ
زیادہ دن تک فائز نہ رہ سکے اور خرابی صحت کی وجہ سے
ان کو ۱۸۰۴ء میں علیحدہ ہو جانا پڑا۔ کمپنی نے ان کی مساعی جمیلہ کا
اعتراف کرتے ہوئے گورنر جنرل کی پرزور سفارش پر سالانہ
تین سو پونڈ کا وظیفہ مقرر کر کے انہیں اس خدمت سے سبکدوش کر دیا۔
ڈاکٹر گل کرسٹ نے چار سال کی قلیل مدت میں اطراف ہند سے
لائق عالموں اور ماہر زبان اشخاص کو کلکتہ میں جمع کر کے ان سے
بیسیوں مفید کتابیں ترجمہ کرائیں اور ان کی سرپرستی و حوصلہ افزائی
سے ان لوگوں میں تصنیف و تالیف کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ ان کے
وطن چلے جانے کے بعد بھی یہ لوگ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ تالیف و ترجمہ
کرتے رہے۔ اُردو میں نظم کا ذخیرہ کافی تھا صرف انتخاب کر کے صحت کے
ساتھ شائع کرنے کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے کالج کے منشیوں سے
اُردو شاعری کے قدیم اساتذہ کے پاکیزہ انتخابات مرتب کرائے
اور ان کو نفاست و خوش سلیقگی سے شایع کیا۔ کالج کی نگرانی میں
ٹائپ پریس بھی قایم کیا اور آج صحافت و علوم کی ترقی کے بعد جس چیز کی
سب سے زیادہ ضرورت ہے یعنے ٹائپ پریس وہ ان کی مساعی سے
اس وقت رائج ہو چکا تھا اگر اس کو اور ترقی و رواج عام دیا جاتا تو آج
اُردو صحافت کہاں سے کہاں پہنچ جاتی۔ یہی چار سال کا زمانہ ڈاکٹر
گل کرسٹ کی زندگی کا بہترین زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں انہوں نے

وہ کام انجام دیا جس نے اُن کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا۔

اگرچہ ڈاکٹر گل کرسٹ صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ دن تک کالج کی صدارت پر مامور رہ کر اُردو ادب کی سرپرستی نہ کر سکے۔ اور انہیں افسوس کے ساتھ اپنے پسندیدہ ملک ہندوستان کو خیرباد کہنا پڑا مگر علمی شغل اور اُردو ادب کی خدمت کا شوق کسی طرح کم نہیں ہوا وہ چند روز اپنے وطن اسکاچستان میں صحت کی خاطر بے کار رہے اور پھر تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا مگر وہاں اس کے لیے کافی مواقع حاصل نہ تھے اور نہ وہ خاطر خواہ کام کر سکتے تھے اس لیے سنہ ۱۸۱۶ء میں لندن آ گئے اور یہاں ایک خانگی درسگاہ قایم کی جس میں اُن نوجوان انگریزوں کو تعلیم دینے لگے جو ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت کے اُمیدوار تھے اور ہندوستان میں کسب معاش کرنا چاہتے تھے۔

اس طریقہ پر کام کرتے ہوئے انہیں ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۸۱۸ء میں بہ مقام لیسٹر اسکویر ایک ادارۂ شرقیہ[1] قایم کیا اور اس میں اُردو کی پروفیسری پر ڈاکٹر گل کرسٹ کو مامور کیا۔ یہ ادارہ خاص طور پر ان امیدواروں کی تعلیم کے لیے قایم ہوا تھا جو کمپنی جانب سے طبی عہدہ دار بنا کر ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ سنہ ۱۸۲۵ء میں نظمائے کمپنی نے تخفیف مصارف کے خیال سے اس مفید ادارے کو برخاست کر دیا اور ڈاکٹر

---

[1] اورینٹل انسٹی ٹیوٹ

گل کرسٹ بھی اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔

ادارے کی برخاست کے بعد بھی انہوں نے یہ کام اپنے طور پر جاری رکھا اور کمپنی کے امیدواران ملازمت کو اُردو سکھاتے رہے۔ اس طرح کئی سال کام کر کے لندن میں اُردو دانوں کی ایک اچھی جماعت پیدا کر دی اور پھر پیرانہ سالی کی وجہ سے اپنا تدریسی کار و بار سینڈ فورڈ ارنات اور ڈنکن فوربس کے سپرد کر کے اپنے وطن چلے گئے اس کے بعد سے ان کی زندگی اجتماعی دلچسپی سے خالی رہی۔ چند دن اسکاچستان میں رہ کر صحت و علاج کی خاطر فرانس کا سفر کیا۔ اور فرانس ہی کے دارالحکومت پیرس میں (۸۸) برس کی عمر میں ۹ جنوری ۱۸۴۱ء کو اُردو کا یہ بے لوث ہی خواہ دنیا سے رحلت کر گیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف کا سلسلہ ۱۷۸۷ء سے شروع ہوتا ہے اسی سنہ میں انہوں نے اپنی مشہور انگریزی ہندوستانی لغت لکھنی شروع کی۔ ان کی تالیفی زندگی کا زمانہ کم و بیش تیس سال کا ہے۔ ذیل میں اُن کی تمام اہم تالیفات کا اجمالی ذکر کیا جاتا ہے۔ جو لنگوسٹک سروے آف انڈیا کی جلد نہم مرتبہ سر جارج اے گریرسن اور خود ان کتابوں کے دیباچوں وغیرہ سے ماخوذ ہے۔

۱۔ **انگریزی ہندوستانی لغت** — یہ انگریزی اُردو کی اولین مبسوط اور مستند لغت ہے جو نو سال کی متواتر محنت کے بعد

پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے،
تحصیل زبان اُردو کے ساتھ ساتھ اس لغت کے مواد کی فراہمی
اور اس کی ترتیب و طباعت میں مصروف رہے۔ ان کا یہ
کارنامہ بذاتِ خود اس قدر اہم ہے کہ اگر وہ کوئی اور کام نہ کرتے
تو صرف اس سے ان کا نام ہمیشہ کے لیے زندہ رہ سکتا تھا۔ اس
سے پہلے اُردو زبان میں کوئی لغت نہ کسی ہندوستانی نے
لکھی تھی اور نہ کسی یورپین نے جس کی وجہ سے ان کا کام بہت
صبر آزما اور دقت طلب ثابت ہوا بڑی تلاش اور کوشش
کے بعد انہیں صرف خالق باری مولفہ حضرت امیر خسرو ملی اس
کے سوا کوئی اور نمونہ اُن کے آگے نہ تھا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے
انگریزی لغتوں کو پیش نظر رکھ کر بالکل ابتدائی اور اصولی طریقے پر
ادب کی اہم کتابیں جمع کیں اور منشیوں اور پنڈتوں کے معقول عملے
کی مدد سے ان کتابوں سے الفاظ انتخاب کر کے ان کے معنی اور
موقع استعمال کا تعین کیا۔ اس اہم کتاب کی اشاعت میں کمپنی
نے بھی ان کی کسی قدر مالی امداد کی انہوں نے کتاب کے کئی حصّے
کر دیے اور خریداروں سے بالاقساط قیمت وصول کر کے کئی سال
میں پورے طور پر اس لغت کی اشاعت کی۔ اس کا پہلا
مکمل ایڈیشن ۱۷۹۲ء عیسوی شایع ہوا۔ اس کے ساتھ انہوں نے
ایک طویل دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں اپنے کام کی

دشواریاں، ذمہ داریاں، طباعت کی پیچیدگیاں، وغیرہ، تفصیل کے ساتھ بیان کی ہیں۔ پہلے ایڈیشن کے کئی سال بعد ۱۸۱۰ء عیسوی میں اس کا دوسرا ایڈیشن خود ڈاکٹر گل کرسٹ نے بہت صحت اور اصلاح کے ساتھ انگلستان سے شایع کیا۔ اس موقع پر کپتان روبک نے بھی جو کلکتے میں ان کے جانشین ہوئے تھے، انہیں خاص طور پر اس کام میں مدد دی۔ اس ایڈیشن میں الفاظ کے معنے بھی رومن حروف میں دیے گئے ہیں اور پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے بڑی کوشش اور توجہ سے ایسے قاعدے اور اشارے تفصیل کے ساتھ لکھے گئے ہیں کہ الفاظ اردو کے تلفظ میں غلطی نہ ہو۔ اس ایڈیشن کے ساتھ اردو قواعد کا بھی ایک بسیط خلاصہ جو ابتداءً علم اللسان اردو کے سلسلے میں لکھا گیا تھا، شریک کیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن کے مطابق انگلستان میں کئی اور ایڈیشن شایع ہوئے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی اس لغت کے نسخے آج کل بہت کم یاب ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا ایک قدیم نسخہ مولوی محمد یافعی صاحب کے کتب خانے میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ کتب خانۂ جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک نسخہ ہے۔ سٹی کالج کے کتب خانے میں ۱۸۲۵ء عیسوی کا ایک مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۸۱۰ء کے مرتبہ نسخے کی طباعتِ دوم ہے۔ یہ نسخہ بہت عمدہ حالت میں ہے۔

۲۔ **ہندوستانی علم اللسان** ۔۔۔ یہ اُردو کی لسانیات پر ایک دلچسپ تصنیف ہے اس میں انگریزی اُردو اور اُردو انگریزی کی ایک طویل فرہنگ بھی دی ہے۔ نیز اُردو کے قواعد زبان پر ایک عالمانہ مقدمہ ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کب شایع ہوا معلوم نہیں۔ دوسرا ایڈیشن کپتان ٹامس روبک نے بہت کچھ اضافوں اور ترمیم کے بعد اڈنبرا سے سنہ ۱۸۱۰ء میں شایع کیا۔ لندن سے ڈاکٹر گل کرسٹ نے سنہ ۱۸۲۵ء میں تیسرا ایڈیشن نکالا تھا۔

۳۔ **اردو کی صرف و نحو** ۔۔۔ یہ کتاب دراصل ڈاکٹر صاحب کے مجوزہ سلسلہ علم اللسان اُردو کی جلد اول کا تیسرا حصّہ ہے سنہ ۱۷۹۶ء میں کلکتہ سے شایع ہوئی اور فورٹ ولیم کالج کے نصاب تعلیم میں شریک کی گئی اس ضرورت سے اس کے دو چار ایڈیشن جلد جلد شایع ہوئے میر بہادر علی حسینی نے سنہ ۱۸۰۳ء میں "اُردو رسالہ گل کرسٹ" کے نام سے اس کا ایک خلاصہ بھی مرتب اور شایع کیا تھا۔

۴۔ **مشرقی زباندان** ۔۔۔ یعنی "ہندوستان کی مقبول خاص و عام زبان کا آسان مقدمہ" اس کے ساتھ بھی انگریزی اُردو اور اُردو انگریزی الفاظ کی ایک مبسوط فرہنگ ہے۔ ایک ضمیمہ الات جنگ

اُردو اسما پر بھی شریک کیا گیا ہے اور ایک علٰحدہ عنوان سے زبان کے ابتدائی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۷۹۶ء اور دوسرا ۱۸۰۲ء میں شایع ہوا۔

۵۔ اردو زبان پر مختصر مقدمہ

—— یہ "مشرقی زباندان" کا خلاصہ ہے جو ۱۸۰۰ء میں کلکتہ سے شایع ہوا تھا۔

۶۔ ہندی کی آسان مشقیں

—— یہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی اور آخری امتحانات کی تیاری کرنے والے امیدواروں کی سہولت کے لیے مرتب کی گئی تھیں۔ اُن کی پہلی اشاعت ۱۸۰۲ء میں ہوئی۔

۷۔ فارسی افعال کا جدید نظریہ

—— افعال کی بحث پر یہ مفید کتاب خود مصنف نے اپنے اہتمام سے ۱۸۰۱ء میں چھاپی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں نکلا۔ افعال پر بحث کرنے کے بعد مختلف افعال کے انگریزی اور اردو میں مترادفات بھی دیے ہیں۔

۸۔ اجنبیوں کے لیے رہنمائے اردو

—— یہ کتاب ڈاکٹر گل کرسٹ نے انگریزوں کو اُردو زبان میں جلد سے جلد دستگاہ پیدا کرانے کے لیے بڑے غور و خوض کے بعد مرتب کی تھی اس کی

اشاعت پہلی مرتبہ کلکتہ سے ۱۸۰۲ء میں ہوی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۸۰۸ء میں لندن سے شایع کیا گیا۔ اپنے قیام لندن کے زمانہ میں مصنف نے اس کی نظر ثانی کی اور اصلاح و اضافہ کے بعد ۱۸۲۰ء میں تیرا ایڈیشن شایع کیا۔

۹۔ بیاض ہندی —— یہ ڈاکٹر گل کرسٹ کا وہ دلچسپ انتخاب ہے جس کو فورٹ ولیم کالج کے مشاہیر اہل قلم کے کارناموں کا گلدستہ کہنا چاہیے اس میں کالج کے تقریباً تمام بلند پایہ مولفین کی کتابوں کے نمونے شامل ہیں اس انتخاب کی ترتیب میں میر عبداللہ مسکین نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ انتخاب ۱۸۰۳ء میں طبع ہوا تھا۔ غالباً اس کا صرف یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ اس انتخاب کے مطالعہ سے مصنفین فورٹ ولیم کالج کے طرز بیان اور اس عہد کی اُردو نثر کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۱۰۔ عملی خاکے —— اُردو الفاظ کی قرأت اور ان کو صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنے کے اصول پر ایک مختصر مگر مفید رسالہ ہے یہ پہلی مرتبہ ۱۸۰۲ء میں طبع ہوا۔

۱۱۔ ہندی الفاظ کی قرأت —— یہ مذکورۂ بالا رسالہ

کی طرح ہندی الفاظ کی قرأت کے اصول وضوابط پر مبسوط و مدلل بحث ہے غالباً یہ مذکورۂ بالا رسالہ کی مرمّمہ صورت ہے۔ اس کی اشاعت سنہ ۱۸۱۰ء میں ہوئی تھی۔

۱۲- **اتالیق ہندی** —— اس میں ایسے سلیس اور آسان مضامین کالج کے مختلف اہل قلم سے لکھوا کر جمع کیے گئے ہیں جن کے مطالعہ سے اردو نوشت و خواند آسانی سے سیکھ لی جاسکتی ہے اور اس کا مقصد فارسی سیکھنے والوں میں ابتدائی استعداد پیدا کرنا ہے۔ مضامین کے سلسلہ میں فارسی صرف و نحو کے ابتدائی مسائل پر بھی بحث کی ہے اور فارسی کے بعض سلیس مضامین کے اردو ترجمے بھی شامل کیے گئے ہیں اس کے تین اڈیشن سنہ ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۶ء اور ۱۸۲۱ء میں شائع ہوئے۔

۱۳- **ہندی عربی آئینہ** —— عربی کے ایسے الفاظ کی جدولیں جو اردو زبان کے ساتھ خاص تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا پہلا اڈیشن سنہ ۱۸۰۲ء میں کلکتہ سے شائع کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں کہ دوسرا اڈیشن بھی نکلا یا نہیں۔

۱۴- **مکالمات انگریزی و ہندوستانی** —— اس کتاب میں

اہل یورپ کو بول چال سکھانے اور روزمرہ ضروریات کی باتوں پر
ہندوستانیوں کے ساتھ گفتگو کرنے کا سامان جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب
انگریزوں کے لیے اُردو سیکھنے میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔
اس کے متعدد ایڈیشن کلکتہ۔ اڈنبرا اور لندن سے شایع ہوئے۔

۱۵۔ مشرقی قصے ـــ اس میں حکایات لقمان اور دیگر
مشرقی حکایتوں اور افسانوں کا ذخیرہ انگریزی، فارسی، برج
بھاشا، اور سنسکرت کی کتابوں سے ترجمہ کرکے جمع کیا گیا ہے۔ اس کی
تدوین میں کالج کے دیگر اہل قلم نے بھی بہت کچھ مدد دی ہے۔ اس کی
اشاعت ۱۸۰۳ء میں ہوئی۔

۱۶۔ ہندی داستان گو ـــ اس میں فارسی اور دیوناگری
رسم الخط اور اردو میں اُن کے استعمال پر بھی بحث کی گئی ہے
یہ کتاب ۱۸۰۲ء میں طبع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کی تصانیف کی مذکورہ بالا فہرست سے
ظاہر ہے کہ ان کا مقصد انگریزوں کو اُردو سکھانا تھا اور ان سے
خود ہندوستانی کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے یہ سچ ہے
مگر اُن کی یہ مساعی بھی بالواسطہ اُردو کی نشر و اشاعت اور سمندر پار
ممالک کے باشندوں کو اُردو زبان سے مانوس کرانے کی وجہ سے

بعد [illegible] انگریزوں کے بعد آنے والے انگریز حاکم بھی اُن کی
طرح اردو کی سرپرستی [illegible] اور دفاتر و مدارس میں انگریزی کو جاری
و ساری کرنے کے بجائے اردو ہی کی وسعت اور اس کی تحصیل میں دلچسپی
لیتے تو آج اُردو کی دنیا نہایت ہی وسیع ہوتی اور اس کا حلقۂ اثر
بھی انگریزی کی طرح دنیا کے ایک بڑے حصّہ کو گھیر لیتا ۔ افسوس کہ
انگریزوں نے بہت جلد اس زبان کی طرف سے نہ صرف اپنی توجہ
ہٹالی بلکہ اس کو سرکار دربار سے بھی نکال باہر کیا اور کس مپرسی کی
حالت میں خود اہل زبان یعنے ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دے دیا۔
مگر اُردو کو ترقی ہونی تھی جو باوجود سارے ہندوستان میں انگریزی
زبان کا تسلط عام ہو جانے کے اس نے ترقی کی اور آج اپنے بل بوتے
پر قائم ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ برابر ترقی کے قدم بڑھائے
جا رہی ہے ۔ وہ دن کچھ دور نہیں کہ جامعہ عثمانیہ کی بدولت جس نے
اس دور حاضر میں اردو کی عدیم النظیر سرپرستی شروع کی ہے
اُردو زبان علوم و فنون کے تمام ذخائر و خزائن سے مالا مال ہو جائے
اور دنیا کی مشہور اور بلند پایہ زبانوں میں شمار ہونے لگے۔

قواعد زبان اور تدوین لغت پر اہل زبان نے اپنے استغنا کی
وجہ سے بالکل توجہ نہیں کی اور اُردو کی جو کچھ ابتدائی کتب صرف و نحو
لکھی گئیں وہ اہل یورپ ہی کی ہیں ۔ اہل یورپ کو ہندوستان میں
تجارتی اغراض کی وجہ سے اس طرف توجہ کرنی پڑی مولوی عبدالحق صاحب

نے اپنی مشہور قواعد اردو کے طویل دیباچہ میں اس کی پوری تفصیل دی ہے۔[1]
اہلِ زبان میں صرف ایک انشاء اللہ خاں ہی ایسے ہیں جنہوں نے اس زمانہ میں جبکہ ان کے
معاصرین صرف مشاعروں میں غزلیں پڑھنے اور شعر و شاعری سے
مجالس و دربار گرمانے میں مصروف تھے، اس ضروری اور مفید کام کی
طرف توجہ کی اور دریائے لطافت سی لطیف و پُرمغز کتاب لکھ ڈالی۔
ان کا یہ کارنامہ ان کی ساری عمر کی کمائی یعنے کلیات سے زیادہ شہرت
و وقعت کا مستحق ہے اور رہیگا۔ انگریز مولفین قواعد میں، ڈاکٹر
گل کرسٹ کو اولیت حاصل ہے۔ انگریزی اردو لغت بھی سب سے
پہلے انہوں نے ہی لکھی ہے۔ ان کے بعد اور بھی انگریزوں نے
مثلاً ڈنکن فاربس۔ ڈاکٹر فیالن، جان شیکسپیر اور جوزف ٹیلر وغیرہ
نے اُن کی تقلید میں لغات لکھیں اور اس طرح اردو کی نشر و اشاعت
میں نمایاں حصہ لیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ انگریزی کی جامع لغتوں کی طرز پر اردو
انگریزی لغت مرتب کرنا چاہتے تھے اور ۱۷۸۶ء میں اس کا
ایک حصہ شائع کرکے اصل کام کی بنیاد ڈالی۔ مگر افسوس کہ وہ
اپنے خیال کے موافق اس تجویز میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس راہ
میں انہیں طرح طرح کی مشکلات پیش آئیں۔ جہاں تک الفاظ کا

---

[1] قواعد اردو مولفہ عبدالحق صہ۳۔

ٹامس رُوبک اور جوزف ٹیلر

(۵)

اُردو نہ صرف جان گل کرسٹ بلکہ اور بھی بہت سے انگریز حاکموں اور عہدہ داروں کی منظورِ نظر رہی ہے ۔ فورٹ ولیم کالج کے پروفیسروں کے علاوہ بہت سے انگریز اور فرانسیسی اس کی تحصیل تعلیم اور نشر و اشاعت میں حصہ لیتے رہے ہیں ۔ فرانسیسی محقق اُردو گارساں دی تاسی نے تاریخ ادبیات اُردو اور خطبات کی صورت میں اپنی عظیم الشان یادگار چھوڑی ہے ۔ یورپ کے اکثر ممالک کے باشندوں نے اردو کی قواعد اور لغت وغیرہ کی متعدد کتابیں لکھی ہیں ۔ ہم کو فی الوقت اپنے مقصد کے لیے ان پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور جانشین کی حیثیت سے یہاں صرف دو انگریز محسنین اُردو کا ذکر کیا جاتا ہے ۔ اگر یورپی محسنان اُردو کا تفصیلی ذکر کیا جائے تو ایک علٰحدہ کتاب لکھنے کی ضرورت ہے ۔

کپتان ٹامس روبک ۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اُردو اہلِ قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی ۔ وہ ابتداءً فوج میں ملازم ہوئے اور لفٹنٹ اور پھر کپتان کے درجے تک ترقی کی ۔ ان کو اُردو زبان اور اس کے ادب سے خاص شغف تھا ۔ ڈاکٹر گل کرسٹ

کے فیض صحبت سے ان میں اُردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا ہو گیا تھا
وہ پہلے فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے۔ جب ۱۸۰۴ء
میں ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی صدارت اور اُردو کی پروفیسری سے
سبکدوش ہو گئے تو یہی ان کی جگہ مامور ہوئے۔ مصنفین و مولفین کی
سرپرستی کر کے بڑا نام پیدا کیا۔ بہت سے مصنفین اور اہل قلم کو
تصنیف و تالیف کی ترغیب دی اور متعدد کتابیں شائع کرائیں۔
ان میں سے ایک منشی بینی نارائن جہاںؔ ہیں جو کپتان روبک ہی کی بدولت
مصنف ہے۔ کپتان روبک کو عام نثری کتابوں کے علاوہ اُردو شاعری
سے بھی خاصی دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن جہاںؔ سے شعرائے
اُردو کا تذکرہ لکھوایا۔ مرزا جان طپشؔ نے جو کلکتہ کے مشہور شاعر اور
فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے، اپنی مثنوی بہار دانش میں ان کی تعریف
عجیب پُرلطف انداز میں کی ہے ؎

پھر آ گئے کہاں وہ زبان و بیاں | ادا ہو جو کپتان صاحب کی شاں
شریف النسب اور گرامی شکوہ | حکیم و ظفر و متدد دانش پژوہ
امارت میں شوکت میں عالی طریق | بہ تسخیر دلہا شفیق و خلیق
ہنر سنج و دقاق و معنی شناس | سخن کے سخنداں کا ہے جس کو پاس
شرف جس سے تازہ ہیں کو ہے ملا | دیا جس نے تعلیم کو مرتبا
زبس ہے سب آگاہ علم و کمال | دقائق میں ہے ریختے کے مثال
کہیں کیوں نہ ہم اس کو طوطی مقال | کہ ہندی زباں کا ہے صاحب کمال

حق اس کے تئیں نت سلامت رکھے سلامت رکھے باکرامت رکھے

کپتان روبک "ہندوستانی لغت" کی تدوین میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے شریک کار اور ان کی تجویز کے ہر طرح ممد و معاون تھے۔ بطور خود بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں ان میں سے ایک "لغت جہاز رانی" ہے اس میں بحریہ اور جہاز رانی کی تمام اصطلاحیں اور الفاظ انگریزی اردو میں جمع کیے گئے ہیں اور ایسے الفاظ اور جملوں کا بھی ذخیرہ کثیر ہے جو انگریز کمانداروں کو میدان جنگ اور بارکس میں ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ بول چال میں کار آمد ہو سکتے ہیں پھر اردو کی قواعد پر ایک مختصر رسالہ بھی اس کے ساتھ میں بطور ضمیمہ شریک کیا۔ اس مفید لغت کی پہلی اشاعت کلکتہ سے ۱۸۱۱ء میں ہوئی۔ دو سال بعد دوسرا ایڈیشن لندن سے شایع ہوا۔ کپتان روبک کی دوسری کتاب "ترجمان ہندوستانی" (ہندوستانی انٹرپریٹر) ہے اس میں قواعد زبان اردو کے ابتدائی مسائل مندرج ہیں۔ یہ کتاب پہلے لندن سے ۱۸۲۴ء میں اور پھر پیرس و لندن سے ۱۸۴۱ء میں شایع ہوی تھی۔ اہل یورپ کو اردو زبان کی تحصیل میں ان کتابوں سے بہت مدد ملتی رہی ہے۔ کپتان روبک نے ان کتابوں کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی ایک مبسوط تاریخ بھی انگریزی زبان میں لکھی ہے۔

کپتان ٹیلر | کپتان جوزف ٹیلر بھی اردو زبان کے دلدادہ اور فورٹ ولیم کالج میں اردو کے پروفیسر تھے انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ اور کپتان روبک کی طرح ایک بسیط اردو انگریزی لغت مرتب کی ہے ابتداءً اسے اپنے ذاتی استعمال

کے لیے بطور فرہنگ تیار کی تھی۔ پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر ایم، ڈی کی مدد سے اس کو باضابطہ مرتب و شایع کیا۔ ڈاکٹر ہنٹر بھی کالج میں ملازم اور اُردو سے خاص دلچسپی رکھتے تھے طپش نے ان کی بھی مدح کی ہے جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

چل اے خامہ کالج کی توصیف کر — ہوئے مجتمع جس میں اہل و ہنر
فصاحت بلاغت کا ہے جو مقام — جو ہے تربیت گاہ ہر خاص و عام
رہے ڈاکٹر ہنٹر اس میں سدا — ہر اک اہل حاجت کا حاجت روا
تنعم، تمکن، ترحم، کرم — عیاں اس کے سیما پہ ہے دمبدم
ہے وابستہ اس سے ہر اہل سخن — کہاں ایسے ہوتے ہیں آگاہ فن
شرف اس نے ہندی زباں کو دیا — دیا نظم اُردو کو یہ مرتبا
ترقی سب اس کی اسی سے ہوئی — ہوئی قدر اس سے تصانیف کی

کپتان ٹیلر کی لغت بھی نہایت کارآمد ہے اس کی تدوین میں کالج کے دیسی علما نے بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۸ء میں شایع ہوا تھا پھر ولیم کارمیکائیل اسمتھ نے اس کی نظرثانی کر کے ایک مختصر ایڈیشن ۱۸۲۰ء میں شایع کیا تھا۔ کپتان ٹیلر اور ڈاکٹر ہنٹر دونوں نے اُردو نثر نویسوں کی سرپرستی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ان ہی اُردو پسند انگریزوں کی بدولت فورٹ ولیم کالج قائم رہ کر اُردو ادب کی خدمت کرتا رہا۔

میر امّن دہلوی

فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے نثر نویسوں میں تین شخص خاص طور پر
مقبول انام ہیں (۱) میر امّن دہلوی (۲) میر شیر علی افسوس (۳)
سید حیدر بخش حیدری۔ ان میں بھی سب سے زیادہ شہرت و مقبولیت
صرف میر امّن ہی کے حصہ میں آئی۔ اس کالج کے مصنفوں میں سے
اکثر نے بہت سی کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں۔ بعض تو شاعر اور اچھے
شاعر تھے۔ انہوں نے نثری کتابوں کے علاوہ اپنے اشعار بھی
اپنی یادگار چھوڑے ہیں مگر میر امّن کو دیکھو تو صرف دو کتابوں کے مؤلف
ہیں اور ان سے بھی ایک کو تو شہرت نصیب نہ ہوی اور بہت کم لوگ
اس کے نام سے واقف ہیں۔ رہی دوسری تو یہ اُسی کا کرشمہ ہے
کہ میر امّن کا نام جب تک اردو زبان زندہ ہے اور اردو بولنے والی
قوم دنیا کے پردہ پر باقی ہے مٹ نہیں سکتا۔ ان کی کتاب "باغ و بہار"
کی بہار ہمیشہ تازہ ہے۔ اس کو تالیف ہوئے سوا سو برس کا زمانہ دراز
گزر گیا مگر اس کی مقبولیت میں کمی نہ ہوی۔ یہ مصرع گویا اسی کے متعلق
لکھا گیا تھا ع ہے تازگی وہی پر اس قصۂ کہن میں۔

میر امّن کے حالات زندگی سے اردو کے تقریباً تمام تذکرے
خالی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے وہ شاعر نہیں تھے اور اگر تھے بھی تو

شعر و شاعری کی بدولت ان کی کچھ شہرت نہ ہوی اور کسی تذکرہ نویس
نے ان کا حال اپنے تذکرہ میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی
بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا اصلی نام میر امان تھا اور امّن تخلص ہے
مگر وہ میر امّن ہی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مولد وطن دہلی ہے
ان کو دلّی پر اور دلّی کو ان پر ناز ہے اور بجا ہے۔ اُن کے آباواجداد
بیرون ہند کے رہنے والے تھے اور خاندان مغلیہ کے دوسرے
فرماں روا ہمایوں بادشاہ کے عہد حکومت میں ہندوستان میں وارد
ہوئے۔ غالباً آگرہ میں قیام اختیار کیا ہوگا ہمایوں بادشاہ سے
لے کر عالمگیر ثانی (سنہ ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۹ء) کے ایام فرماں روائی تک
ان کا خاندان شاہان مغلیہ کے رکاب سعادت میں ملازم رہا
اور اُن کے آباواجداد پشت بہ پشت بادشاہوں کی پیشی میں
حاضر اور اپنی جاں فشانی و جاں بازی کی وجہ سے مورد الطاف و
عنایات رہے۔ اعلیٰ خدمات کے علاوہ جاگیر و منصب بھی ملا اور
امرائے مغلیہ میں شمار کئے جانے لگے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا۔ میر امّن دہلی ہی میں پیدا ہوے اور
وہیں پرورش پائی اور اساتذہ دہلی ہی سے علوم متداولہ حاصل
کئے۔ بچپن سے تیتیس چالیس سال تک کی عمر اسی "اجڑی ہوی دلّی"
میں گزاری۔ میر امّن کے والد کا آخری اور ان کے بچپن اور جوانی کا
سارا زمانہ سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال کا دور تھا۔ بادشاہ

کمزور و عیش پسند تھے۔ ان میں جہاں بانی و کشور کشائی کی نہ تو اُمنگ باقی تھی اور نہ قابلیت ہی رہی تھی۔ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وزراء امراء اپنی خود مختاری کی فکریں کرنے لگے۔ مگر خود ان کے آپس میں آئے دن کے جھگڑوں نے بیرونی بادشاہوں کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جراءت دلائی۔ سرکشوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اور اندرون و بیرون ملک کی تمام چھوٹی اور بڑی قوتیں اپنی تقویت و ترقی میں سر توڑ کوششیں کرنے لگیں۔ کچھ عجیب طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ آج ایک "صاحب عالم" تخت نشین ہوتے ہیں اور کل انہی کو تہ تیغ کر کے بادشاہ گر امرا دوسرے دعویدار سلطنت کے سر پر تاج پہناتے ہیں۔ اس افرتفری کو دیکھ کر سرحدی قبایل کے سرداروں اور افغانی حکمرانوں کو لوٹ مار کا شوق ہوا۔ اور وہ اپنے پوشیدہ ارادوں کو کامیاب بنانے لگے۔ احمد شاہ درّانی دندناتا ہوا اپنی تازہ ولایتی فوج لے کر دہلی میں داخل ہوا۔ اور ۱۷۵۶ء میں دلّی کی ساری دولت لوٹ لی۔ بادشاہ پہلے ہی شطرنج کے شاہ تھے اب اور بھی مجبور ہو گئے۔ دولت کے ساتھ اقتدار بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر جس کے جی میں جو آیا کر گزرا۔ سورج مل جاٹ بھرت پوری نے چھوٹے چھوٹے امرا کی جاگیریں ضبط کر لیں اور دلّی پر کچھ اس طرح کی تباہی و بربادی چھا گئی کہ اچھے اچھے گھرانے تباہ ہو گئے۔ لوگ دلّی چھوڑ کر بھاگنے لگے اور جہاں جس کو پناہ ملی

وہیں کا ہو رہا۔ میر امّن خاندانی مناصب و اعزاز کھو کر بھی ایک زمانہ
تک دلی ہی میں رہے مگر بقول غالب ع

ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا

آخر وہ بھی نہ ٹک سکے اور عسرت و سراسیمگی کی حالت میں بہ یک بینی
و دو گوش تلاش معاش میں چل کھڑے ہوئے۔

دلی سے نکلنے کے بعد طے منازل و قطع مراحل کرتے ہوئے
عظیم آباد (پٹنہ) پہنچے اور یہاں بری بھلی طرح چند سال بسر کیے۔
آخر جب کچھ نباہ نہ دیکھا تو اہل و عیال کو وہیں چھوڑ کر تن تنہا کسی
اچھی نوکری کی تلاش میں نکلے اور کلکتہ جا پہنچے۔ نواب دلاور جنگ
نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کا اتالیق بنایا دو سال
یہ نوکری بھی کی مگر یہاں بھی کچھ نباہ نہ ہو سکا۔

ان ہی دنوں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے لئے لایق ادیبوں اور
ماہر منشیوں کی ضرورت داعی ہوی اور ہندوستان کے مختلف حصص سے
لایق لوگوں کو بلوا کر اس کالج میں ملازمت دی جانے لگی۔ میر امّن
کے دوست منشی میر بہادر علی حسینی اس کالج کے میر منشی تھے۔ میر امّن
بھی ان کے وسیلے سے ڈاکٹر گلکرسٹ تک پہنچ گئے اور انھوں نے
ان کی لیاقت و زبان دانی دیکھ کر ان کو کالج میں ملازم رکھ لیا۔
یہ ملازمت مستقل تھی یہاں ملازم ہو کر میر امّن نے اطمینان کا سانس
لیا۔ اور بیوی بچوں کو بھی عظیم آباد سے کلکتہ بلوا لیا۔

میر امّن کی نہ تو تاریخ پیدائش معلوم ہے اور نہ تاریخ وفات اور نہ ٹھیک طور پر یہ معلوم ہو سکا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے ۔ البتہ اس کا تعین کرنا آسان ہے اور ہم بلا کسی شک وشبہ کے یہ قرار دے سکتے ہیں کہ وہ اوائل ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کی سلک ملازمت میں منسلک ہوئے یہاں ان کی علمی خدمات کا سلسلہ کس سنہ تک جاری رہا' نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی موجودہ دونوں کتابیں ۱۸۰۲ء کے آخر تک پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی تھیں اس کے بعد انھوں نے کیا کام کیا اور کونسی کتابیں لکھیں کچھ حال معلوم نہیں ۔ البتہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ ۱۸۰۲ء کے بعد سے تصحیح و نظر ثانی کتب اور قدیم اساتذ کے دواوین وغیرہ کے انتخاب کا کام کیا ہوگا۔ کیونکہ کالج کی طرف سے بہت سی نظم کی کتابیں اور دواوین اساتذہ کے انتخابات نہایت صحت اور اہتمام کے ساتھ شایع ہوئے ہیں ۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ان کا تخلص امّن تھا' سیر المصنفین کے مؤلف نے لکھا ہے کہ وہ کبھی اپنا تخلص لطف بھی کرتے تھے مگر کوئی سند یا حوالہ نہیں بیان کیا۔ البتہ باغ و بہار کے خاتمہ پر میر امّن نے جو ابیات لکھی ہیں اُن کی آخری بیت یہ ہے ۔

خدایا بہ حق رسول کبار　　تو کونین میں لطف پر لطف رکھ

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لطف بھی تخلص کرتے تھے

میرامّن باضابطہ شاعر نہ تھے اور نہ شاعری ان کا پیشہ تھی وہ کبھی کبھی دل کی اُپج اور طبیعت کی موزونیت سے شعر کہہ لیا کرتے تھے چنانچہ ڈاکٹر فیلن مشہور یورپین اردو داں و مصنف لغات اُردو نے ایک جگہ بیان کیا ہے کہ میرامّن خود فرمایا کرتے تھے کہ "شاعری میرا پیشہ نہیں ہے نہ میں کسی شاعر کا بھائی۔ میری اردو ٹکسالی اُردو ہے کیونکہ میں دلّی (شاہجہاں آباد) کا روڑا ہوں اور یہیں کا پرورش یافتہ ہوں" اس کے علاوہ میرامّن نے اپنی کتاب "گنج خوبی" کے دیباچہ میں اپنے پیشہ ور شاعر نہ ہونے کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی ہاں مگر خود بخود جو کوئی مضمون دل میں آیا تو اُسے باندھ ڈالا۔ نہ کسو کا استاد نہ کسی کا شاگرد۔ بیت

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی　　فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"[1]

میرامّن کے یہ حالات زیادہ تر خود ان ہی کے مختلف بیانات سے ماخوذ ہیں جو انھوں نے "باغ و بہار کے دیباچے میں لکھے ہیں دیباچے کے اس حصہ کو نقل کرنا جب کہ ہم اوپر حالات بیان کر چکے ہیں تطویل سے خالی نہیں مگر اس لحاظ سے کہ میرامّن نے اپنا ذکر بھی اپنے مخصوص رنگ میں عجیب لطف کے ساتھ لکھا ہے اس کے کچھ حصے کا اعادہ

---

[1] گنج خوبی مطبوعہ مطبع محبوب بمبئی ۱۲۹۳ھ

بے جا نہ سمجھا جائیگا اس بیان سے بعض نئی باتیں جن کو ہم نے اوپر نہیں بیان کیا ہے ظاہر ہو جائینگی۔

"میرے بزرگ ہمایوں بادشاہ کے عہد سے ہر ایک بادشاہ کی رکاب میں پشت بہ پشت جانفشانی بجا لاتے رہے اور وہ بھی پرورش کی نظر سے قدردانی جتنی چاہیئے فرماتے رہے۔ جاگیر و منصب اور خدمات کی عنایات سے سرفراز کر کر مالا مال اور نہال کر دیا اور خانہ زاد موروثی و منصبدار قدیمی زبان مبارک سے فرمایا چنانچہ یہ لقب بادشاہی دفتر میں داخل ہوا۔ جب ایسے گھر کی (کہ سارے گھر اُسی گھر کے سبب آباد تھے) یہ نوبت پہنچی کہ ظاہر ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ تب سورج مل جاٹ نے جاگیر کو ضبط کر لیا۔ احمد شاہ درانی نے گھر بار تاراج کیا۔ ایسی ایسی تباہی کھا کر ویسے شہر سے (کہ وطن اور جنم بھوم میرا ہے اور آنول نال وہیں گڑا ہے) جلا وطن ہوا اور ایسا جہاز کہ جس کا ناخدا بادشاہ تھا، غارت ہوا۔ میں بے کسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ ڈوبتے کو تنکے کا آسرا بہت ہے کتنے برس بلدۂ عظیم آباد میں دم لیا۔ کچھ بنی کچھ بگڑی۔ آخر وہاں سے بھی پاؤں اکھڑے۔ روزگار نے موافقت نہ کی۔ عیال و اطفال کو چھوڑ کر تن تنہا کشتی پر سوار ہوا اشرف البلاد کلکتہ میں آب و دانہ کے زور سے آ پہنچا۔ چندے بیکاری گزری اتفاقاً نواب دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر کاظم خاں کی

اتالیقی کے واسطے مقرر کیا - قریب دو سال کے وہاں رہنا ہوا - لیکن بناد اپنا نہ دیکھا - تب منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہٗ کے رسائی ہوئی - بارے طالع کی مدد سے ایسے جوانمرد کا دامن ہاتھ لگا ہے چاہئے کہ دن کچھ بھلے آویں - نہیں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ ایک ٹکڑا کھا کر پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہوں - اور گھر میں دس آدمی چھوٹے بڑے پرورش پا کر دعا اس قدر دان کو کرتے ہیں - خدا قبول کرے" [۱]

باغ و بہار میر امن صرف دو کتابوں کے مترجم یا بالفاظ دیگر مولف ہیں کیونکہ ان کی دونوں کتابوں میں تالیف کی شان پائی جاتی ہے وہ نرے ترجمے نہیں ہیں ان کی پہلی کتاب "باغ و بہار" ہے اس کی تالیف ۱۲۱۵ھ م ۱۸۰۱ء میں شروع ہوی اور ۱۲۱۷ھ میں انجام کو پہنچی - خاتمۂ کتاب میں میر امن لکھتے ہیں -

جب یہ کتاب فضل الٰہی سے اختتام کو پہنچی - جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں کہ اسی میں تاریخ نکلے جب حساب کیا تو بارہ سو پندرہ ہجری کے آخر سال میں کہنا شروع کیا تھا باعث عدم فرصت کے بارہ سو سترہ سن کی ابتدا میں انجام ہوی - اس فکر میں تھا کہ دل نے کہا "باغ و بہار" اچھا نام ہے ہم نام و ہم تاریخ اس میں نکلتی ہے تب میں نے یہی نام رکھا [۲]

---

[۱] دیباچہ باغ و بہار ص ۲ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۳ء [۲] خاتمۃ الکتاب باغ و بہار ص (۲۵۹)

اس کے بعد یہ ابیات لکھی ہیں جن سے کتاب کے متعلق خود مؤلف کے کیا خیالات و توقعات تھے ظاہر ہیں۔

مرتب ہوا جب یہ باغ و بہار — تھے سن بارہ سو سترہ در شمار
کرو سیر اب اس کی تم رات دن — کہ ہے نام و تاریخ باغ و بہار
خزاں کا نہیں اس میں آسیب کچھ — ہمیشہ تر و تازہ ہے یہ بہار
میرے خون دل سے یہ سیراب ہے — اور لخت جگر کے ہیں سب برگ و بار
مجھے بھول جاوینگے سب بعد مرگ — رہیگا مگر یہ سخن یادگار
اسے جو پڑھے یاد مجھ کو کرے — یہی قاریوں سے مرا ہے قرار
خطا گر کہیں ہو تو رکھیو معاف — کہ پھولوں میں پوشیدہ رہتا ہے خار
ہے انساں مرکب ز سہو و خطا — یہ چوکے گا ہر چند ہو ہوشیار
میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں — یہی ہے دعا میری اے کردگار
تری یاد میں یوں رہوں دم بدم — کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھو — نہ شب گور کی اور نہ روز شمار
تو کونین میں لطف پر لطف رکھ — خدایا بحق رسول کبار[۱]

”باغ و بہار“ فارسی قصہ ”چہار درویش“ کا آزاد اردو ترجمہ ہے اس کی تصنیف اور میر امّن کے اردو میں ترجمہ کرنے کی تقریب خود ان ہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے :-

”قصہ چہار درویش کا ابتدا میں امیر خسرو رح دہلوی نے

---

[۱] خاتمۃ الکتاب - باغ و بہار ص (۲۶۰)

اس تقریب سے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا زری زر بخش جوان کے پیر تھے (اور درگاہ ان کی قلعہ میں تین کوس لال دروازہ کے باہر مٹیا دروازہ سے آگے لال بنگلے کے پاس ہے) اُن کی طبیعت ماندی ہوی ۔ تب مرشد کے دل بہلانے کے واسطے امیر خسرو یہ قصہ ہمیشہ کہتے اور بیمار داری میں حاضر رہتے ۔ اللہ نے چند روز میں شفا دی ۔ تب انہوں نے غسل صحت کے دن یہ دعا دی کہ جو کوئی اس قصہ کو سنے گا ۔ خدا کے فضل سے تندرست رہیگا ۔ جب سے یہ قصہ فارسی میں مروج ہوا ۔ اب خداوند نعمت صاحب مروت نجیبوں کے قدر دان جان گل کرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں ترجمہ کرو ۔ موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورہ سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے[1]"

اگرچہ عام طور پر یہی روایت مشہور ہے کہ یہ قصہ ابتداءً امیر خسرو نے لکھا تھا اور خود میر امّن بھی اوپر یہی روایت نقل کرتے ہیں لیکن اس کو امیر خسرو سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ قصہ محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں تصنیف ہوا ہے ۔ مولوی عبدالحق اور پروفیسر شیرانی نے بڑی تحقیق

---

[1] باغ و بہار صفحہ (۳)

سے اس روایت عام کی تردید کی ہے۔ میر امّن سے کئی سال قبل میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے اس قصہ کو اردو میں ترجمہ کر کے "نوطرز مرصع" نام رکھا تھا میر امّن نے تحسین کے نسخے کو بھی پیش نظر رکھا ہے اور اکثر صورتوں میں اسی کی ترتیب وغیرہ کی پابندی کی ہے۔

اس موقع پر ہم تحسین کا بھی کچھ ذکر کر دینا مناسب خیال کرتے ہیں تحسین میر باقر خاں شوق کے بیٹے اور اٹاوہ کے رہنے والے تھے وہ "مرصع رقم" کے لقب سے مشہور تھے۔ انہوں نے ابتداً جنرل اسمتھ کے منشی کی حیثیت سے کئی سال کلکتہ میں گزارے۔ جب جنرل اسمتھ نے ہندوستان کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن مالوف انگلستان کی راہ لی تو یہ پٹنہ چلے گئے۔ اور وہاں کی دیوانی عدالتوں میں وکالت کرنے لگے پھر چند سال کے بعد اپنے والد شوق کے قضا کر جانے پر پٹنہ سے نکل کر فیض آباد میں نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴ء تا ۱۷۷۵ء) کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور جانشین نواب آصف الدولہ کے متوسل رہے اور ان ہی کے عہد حکومت میں قصۂ چہار درویش کو بکلف اردو میں "نوطرز مرصع" کے نام سے مرتب کیا۔ مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ تحسین نے ۱۷۹۸ء م ۱۲۱۳ھ میں چہار درویش کو اردو میں ترجمہ کیا مگر یہ تاریخ غلط معلوم ہوتی ہے کیونکہ نواب آصف الدولہ نے ۱۷۹۷ء میں وفات پائی اور تحسین نے "نوطرز مرصع"

میں جو قصیدہ ان کی مدح میں لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ
وہ بقید حیات تھے ۔ غرض یہ ترجمہ ۱۷۹۷ء کے قبل ہوا تھا تحسین نے
اس کے علاوہ فارسی میں تین اور کتابیں لکھی ہیں (۱) ضوابط انگریزی
(۲) تواریخ قاسمی (۳) انشائے تحسین ۔ تحسین معمولی درجہ کے شاعر
تھے اور اس لئے ان کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے حتیٰ کہ لالہ سری رام
مؤلف "خم خانہ جاوید" نے بھی نہیں کیا ہے ۔ حالانکہ وہ ان لوگوں
کا بھی ذکر اپنے بسیط تذکرہ میں کرتے ہیں جو صرف ایک آدھ شعر
لکھ کر مشہور ہوگئے ۔ مولانا آزاد نے اپنے گراں پایہ تذکرہ "آب حیات"
میں تحسین کا ذکر اردو نثر کے پیش رو ہونے کی حیثیت سے کیا ہے ۔
تحسین کی "نوطرز مرصع" بالکل مقبول نہیں ہوئی اس کے صرف
دو تین ایڈیشن بمبئی اور کانپور سے شائع ہوئے اور اب وہ بالکل
کمیاب ہے البتہ برٹش میوزیم میں اس کے دو قلمی نسخے محفوظ ہیں ۔
تحسین کی "نوطرز مرصع" کو میر امن کی "باغ و بہار" سے کچھ نسبت
نہیں تحسین میر امن کی طرح "دلی کے روڑے" اور اردو کے دھنی
نہیں ۔ ان کی زبان گنجلک اور تعقید سے بھری ہوی ہے ۔ اس پر
انھوں نے بجائے فصیح اور سلیس اردو کے مرصع اور پیچ دار فقرے
استعمال کئے ہیں اور عبارت آرائی میں بے حد تکلف سے کام لیا ہے
اول تو کتاب قصہ کی اور پھر عوام الناس کے مطالعہ کے لئے تو
اس کی زبان ضرور سلیس و صاف ہونی چاہئے ۔ عبارت کی سادگی

قصہ کی کامیابی میں بہت بڑا دخل ہے۔ تحسین نے اس کی بدولت نثاران اُردو میں اپنی جگہ تو قائم کر لی مگر وہ ہرگز ان کی یادگار نہ بن سکی اور اس کی بدولت انہیں جو مقبولیت و شہرت ہونی چاہیئے تھی نہ ہو سکی ان کی کتاب افادۂ عام کے قابل نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر گل کرسٹ نے میر امّن سے اس کو پھر مرتب کرایا۔

میر محمد علی خاں اورنگ آبادی المتخلص بہ شوق نے بھی چہار درویش کو ۱۲۱۲ھ اور ۱۲۱۴ھ کے درمیان اُردو میں نظم کیا ہے۔ یہ دکھنی ترجمہ ہے اور دکھنی ادبیات میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ محمد عوض زرّین نے بھی چہار درویش کو نثر اُردو میں لکھا ہے اس کا نام بھی "نوطرز مرصع" ہے اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس کی تاریخ بھی زرّین نے "باغ و بہار" سے نکالی ہے۔

بنا کر یہ گلدستہ روزگار لکھی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

عوض زرّین کی "نوطرز مرصع" میر امّن کی "باغ و بہار" کے ساتھ لکھی گئی ہے مگر دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ عوض زرّین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدائً فارسی چہار درویش کو فارسی ہی میں مختصر کر کے اپنے مربی سیتل پرشاد کو دکھایا تو انھوں نے اس کو اُردو میں ترجمہ کرنے کی فرمایش کی اور اُن کی فرمایش سے یہ اُردو ترجمہ مرتب ہوا۔ اس میں سیدھی سادی عبارت نہیں

چند قصّے بیان کر دئے گئے ہیں - میر امّن کے پاس چاروں درویشوں کی جو مفصل داستانیں ہیں وہ اس میں نہایت ہی اختصار کے ساتھ ذیلی حکایتوں کے حذف کے بعد بیان ہوی ہیں اس کا طرز بیان صاف اور بے تکلف ہے مگر میر امّن کے ترجمہ اور زبان کی خوبی مطلقاً نہیں اس کا ایک قدیم نسخہ ہمارے پیش نظر ہے مگر اس موقع پر اس کا کوئی نمونہ درج کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ دونوں کے ترجموں میں اس قدر مغائرت ہے کہ مقابلہ کچھ زیادہ دلچسپ ثابت نہ ہوگا۔

میر امّن کی "باغ وبہار" کو جو بے انتہا مقبولیت وشہرت حاصل ہوی وہ ان تمام نسخوں میں سے کسی کو بھی نصیب نہ ہوسکی۔ اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شایع ہوا اس کے بعد سے اب تک بیسیوں ایڈیشن ہندوستانی اور انگریزی مطبعوں سے شایع ہوئے - ایل ایف اسمتھ نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے جو پہلی مرتبہ کلکتہ ہی سے ۱۸۴۳ء میں شایع ہوا۔ انگریزی ترجمے کے بھی متعدد ایڈیشن، مدراس، کلکتہ، لندن اور لکھنو سے شایع ہوئے۔ اسمتھ کے علاوہ ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۷ء میں اس کا خلاصہ انگریزی میں طبع کرایا ہے۔ گارسان دی تاسی نے بھی فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۷۸ء میں پیرس میں ایک ایڈیشن شایع کیا۔ نیز غلام محمد خاں خبیر نے "خریطۂ سرور"

کے نام سے اس کو نظم میں بھی منتقل کیا ہے غرض یہ کتاب اتنی مرتبہ چھاپی گئی کہ اگر اس کی تفصیل دی جائے تو دو چار صفحوں میں تمام ہوگی اس کے مقبول عام ہونے کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

باغ و بہار کی مقبولیت و شہرت کا اصلی راز اس کی زبان اور طرز بیان میں پنہاں ہے قصہ تو پہلے ہی شہرت حاصل کر چکا تھا اور میر امّن سے پہلے اور بعد بہت سے لوگوں نے اس کو اپنے اپنے سلیقہ کے موافق اُردو کا جامہ پہنایا مگر میر امّن کے سوا آج کسی کو لوگ جانتے بھی نہیں۔ میر امّن نے اپنی کتاب میں ایسی سحر کاری کی ہے کہ وہی اب تک مقبول ہے اور جب تک اُردو زبان زندہ ہے مقبول رہیگی اور اس کی قدر و قیمت میں مرور ایام کے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی میر امّن خاص دلّی کے باشندے تھے دہلی کی اُردوئے معلیٰ اُن کی زبان تھی "باغ و بہار" انہوں نے اسی ٹکسالی زبان میں لکھی ہے یہی وجہ ہے کہ زبان کا ذوق رکھنے والے جب کبھی ان کی کتاب پڑھتے ہیں تو چٹخارے لیتے ہیں اور ایک ایک جملہ اور فقرہ پر ان کی زبان سے واہ واہ نکلتی ہے اگرچہ میر امّن کی زبان اب سے سوا سو سال بیشتر کی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے مگر وہ آج کل کی زبان سے بھی بہت کچھ ملتی جلتی ہے اور باوجود اتنا زمانہ گزر جانے کے اس کی زبان میں کہنگی پیدا نہیں ہوی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانہ کی

بعض ترکیبیں بدل گئیں، بعض محاوروں کے معنی کچھ سے کچھ ہو گئے بعض لفظ متروک اور بعض الفاظ کی تذکیر و تانیث میں فرق پیدا ہو گیا۔ بعض ہندی الفاظ کو ثقال گراں کی جگہ عربی فارسی لفظ داخل کئے گئے۔ تاہم یہ تبدیلیاں کچھ زیادہ اہم نہیں اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ سوا سو برس کی مدت میں علمی اردو سے قطع نظر ٹکسالی اُردو اور روزمرہ دہلی میں کوئی ایسی زبردست تبدیلی نہیں ہوئی جس کو انقلاب کہا جائے۔ فارسی زبان سے ابتداءً جو ترجمے اُردو میں ہوئے تھے ان میں فارسی کے اتباع میں مضاف کو مضاف الیہ کے پہلے لایا جاتا تھا اور چونکہ ہندی کا اثر بہت زیادہ تھا۔ ہندی الفاظ بکثرت اُردو کتابوں میں رائج تھے مگر میرامن نے اپنے معاصرین کے مقابلہ میں ہرگز اتنے زیادہ ہندی الفاظ استعمال نہیں کئے کہ کتاب کا سمجھنا مشکل ہو جائے اُن کی زبان کی غیر مانوس ترکیبوں اور متروک الفاظ وغیرہ کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔

تباہی کھانا۔ یہ اس زمانہ کا مخصوص محاورہ ہے

وہ کی جمع وے۔ اب بالکل متروک ہے۔

امیروں کی جگہ امراؤں۔ یہ ترکیب بھی بالکل متروک ہے۔

بعض خالص ہندی الفاظ۔ چوچگی، اوگت، ندان وغیرہ اب یہ الفاظ اُردو سے خارج ہو گئے ہیں۔

مضاف الیہ کے پہلے مضاف کا استعمال جیسے اقبال اُن کا

فقروں کے بیچ میں جملہ معترضہ کا استعمال جیسے "جان گل کرسٹ صاحب کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے، لطف سے فرمایا۔"

خلعت کو مونث لکھا ہے مگر اب اس کو مذکر لکھتے ہیں۔

باغ و بہار کی زبان کے علاوہ طرز بیان میں بھی ایسی دلکشی اور دلفریبی ہے کہ قصوں کے طویل ہونے اور قصہ کے بیچ میں قصہ آجانے کے باوجود طبیعت اکتاتی نہیں اور جی یہی چاہتا ہے کہ کتاب ختم کیے بغیر نہ رکھی جائے۔ فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں میں کسی کے طرز بیان میں یہ دل کشی نہیں۔ اگر کسی کی زبان اور طرز بیان میر امن کے لگ بھگ ہوسکتا ہے تو وہ صرف شیر علی افسوس ہیں۔ مگر ان کا طرز بیان بھی میر امن کا سا سادہ اور پُر لطف نہیں ہے۔

میر امن کے طرز بیان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ محاورہ اور روزمرہ کے آگے قواعد زبان کی پابندی کی پروا نہیں کرتے۔ بہادر علی اور میر امن میں ایک خاص فرق یہی ہے کہ حسینی قواعد زبان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ان کے فقرے طولانی اور بے مزہ ہو جاتے ہیں مگر وہ آگے پیچھے کے دو چار لفظ محذوف کر کے قواعد کی خلاف ورزی کرنا نہیں چاہتے اور میر امن اس کے برخلاف بول چال کی زبان کو ترجیح دیتے ہیں اور حشو و زوائد کے حذف

کرنے میں بڑی دریا دلی سے کام لیتے ہیں۔ قصہ کی کتابوں میں اس کی سخت ضرورت ہے قصہ اول تو کوئی ٹھوس علمی چیز نہیں ہوتا کہ اس میں نفس مضمون پر زیادہ نظر رکھی جائے اور زبان کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کی جائے علمی تصانیف میں البتہ یہ طرز بنھ نہیں سکتی وہاں سنجیدگی کی ضرورت ہے اور جن لوگوں نے علمی اور تاریخی تصانیف میں بھی اس طرز کو برتنے کی کوشش کی وہ ناکام رہے اور وہاں ان کی یہ طرز بالکل بے موقع اور مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

قصوں اور افسانوں کا تعلق ادبیات لطیف سے ہے۔ اور اُن کی زبان جتنی زیادہ سادہ صاف اور پُر لطف ہوگی اتنی انکی لطافت زیادہ ہوگی اور وہ ادبیات لطیف سمجھی جائینگی جن لوگوں نے اس گُر کو بھلا دیا اور اس کی پروا نہ کی آج ان کے قصوں اور افسانوں کو گمنامی کا گوشہ نصیب ہوا اور جن لوگوں نے اس پر کار بند ہو کر اپنے قصوں کی رنگ آمیزی کی ہو وہ مقبول انام ہوئے اور اُن کے کارنامے ادبیات لطیف میں داخل ہیں۔

میرامن کے طرز بیان کی مقبولیت نے بہت سے مصنفین میں ان کی تقلید کا شوق پیدا کیا ان میں مولانا نذیر احمد دہلوی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی "توبۃ النصوح" میں "باغ و بہار" کی بہت سی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور دونوں کی زبان و بیان کا مقابلہ کیا جائے تو سوا سو برس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ظاہر ہو جائینگی اور یہ بھی

معلوم ہو جائیگا کہ ان دونوں میں کس قدر یکسانیت ہے۔ مولانا نذیر احمد کے مقلدین مولوی راشد الخیری و بشیر الدین احمد دہلوی میں بھی میر امن کی طرز کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ذیل میں باغ و بہار کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے اس سے ان کے طرز بیان و زبان کی خصوصیات اور خوبیاں ہویدا ہو جائینگی۔

"سن اے عزیز! میں بادشاہ زادہ جگر سوز اس اقلیم نیم روز کا ہوں بادشاہ یعنے قبلہ گاہی نے میرے پیدا ہونے کے بعد نجومی اور رمال اور پنڈت جمع کیے اور فرمایا کہ احوال شہزادے کے طالع کا دیکھو اور جانچو اور جنم پتری درست کرو اور جو کچھ ہونا ہے حقیقت پل پل، گھڑی گھڑی اور پہر پہر، اور دن دن، مہینے مہینے، اور برس برس کی مفصل حضور میں عرض کرو۔ بہ موجب حکم بادشاہ کے سب نے متفق ہو اپنے اپنے علم کی رو سے ٹھہرایا اور سادھ کر التماس کیا کہ خدا کے فضل سے ایسی نیک ساعت اور شبھ لگن میں شہزادے کا تولد اور جنم ہوا ہے کہ چاہیے کہ سکندر کی سی بادشاہت کرے اور نوشیروان سا عادل ہو اور جتنے علم و ہنر ہیں ان میں کامل ہو اور جس کام کی طرف دل اس کا مائل ہو وہ بخوبی حاصل ہو۔ سخاوت و شجاعت میں ایسا نام پیدا کرے کہ حاتم اور رستم کو لوگ بھول جاویں لیکن چودہ برس تک سورج اور چاند دیکھنے سے ایک بڑا خطرہ

نظر آتا ہے بلکہ یہ وسواس ہے کہ جنونی اور سودائی ہو کے بہت آدمیوں کا خون کرے ۔ اور بستی سے گھبراوے جنگل میں نکل آوے اور چرند پرند کے ساتھ دل بہلاوے۔اس کا تقید رہے کہ رات دن آفتاب ماہتاب کو نہ دیکھے بلکہ آسمان کی طرف بھی نگاہ نہ کرنے پائے جو اتنی مدت خیر و عافیت سے کٹے تو پھر ساری عمر سکھ چین سے سلطنت کرے ۔

یہ سن کر بادشاہ نے اسی لئے اس باغ کی بنا ڈالی اور مکان متعدد ہر ایک نقشے کے بنوائے میرے تئیں تہ خانے میں پلنے کا حکم کیا اور اوپر ایک برج نمدے کا تیار کروایا تو دھوپ اور چاندنی اس میں سے چھنے ۔ میں دائی دودھ پلائی اور انگا چھوچھو اور کئی خواصوں کے ساتھ اسی محافظت سے اس مکان عالی شان میں پرورش پانے لگا اور ایک استاد دانا کار آزمودہ واسطے میری تربیت کے متعین کیا تو تعلیم ہر فن اور ہنر کی اور مشق ہفت قلم لکھنے کی کرے ۔ اور جہاں پناہ ہمیشہ خبر گیراں رہتے دم بدم کی کیفیت روزمرہ حضور میں عرض ہوتی ۔ میں اس مکان کو عالم دنیا جان کر کھلونوں اور رنگ برنگ کے پھولوں سے کھیلا کرتا اور تمام جہاں کی نعمتیں کھانے کے واسطے موجود رہتیں جو چاہتا سو کھاتا ۔ دس برس کی عمر تک جتنی صنعتیں اور قابلیتیں تھیں تحصیل کیں ۔ (باغ و بہار صفحہ ۱۰۲)“

قدیم قصوں کا مقصد صرف دل بہلائی ہی نہیں بلکہ اس کے ضمن میں خاص خاص چیزوں کی تعلیم دینا بھی ہوتا تھا مگر تعلیم کا پیرایہ ایسا اختیار کیا جاتا تھا کہ قاری کی طبیعت ناصحانہ باتوں سے بیزار ہوئے بغیر بطور خود اس سے نصیحت حاصل کرلے۔ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کے مضامین پر ایک نظر بازگشت ڈالی جائے تو مصنف کی تعلیم ظاہر ہو جاتی تھی مثلاً بعض قدیم قصوں کا مقصد شہزادوں اور امیرزادوں کو رحم و انصاف، سخاوت و فیاضی پر آمادہ کرنا، اوسط درجہ کے لوگوں کو تجارت اور سیر و سیاحت کا شوق دلانا۔ شادی کو کسی مشکل سوال کے حل کرنے پر منحصر قرار دینا ہوتا تھا تاکہ نوجوانوں میں جاں بازی و مبارز طلبی کا شوق پیدا ہو، "باغ و بہار" میں بھی اسی قسم کی تعلیم دی گئی ہے میر امن جو باتیں قارئین کے ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تقدیر اٹل چیز ہے انسان اگر کسی شدنی کام کو روکنا چاہے اور اگر اس کا ہونا اس کو پہلے ہی سے معلوم بھی ہو جائے تو وہ ہرگز اس کو روک نہیں سکتا۔ جب اس شدنی امر کا وقت آئیگا وہ ہو کر رہیگا اور کوئی نہ کوئی غلطی ایسی سرزد ہو جائیگی جس سے اس کے روکنے کی تمام تدابیر باطل ہو جائینگی۔ جس شخص کی قسمت میں جو بدا ہے اس کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی اس مسئلہ کی تائید ایک دو نہیں اکثر حکایات سے ہوتی ہے مثلاً بصرہ کی شہزادی کو بادشاہ کا خفا ہو کر بالکل عسرت کے ساتھ نکال دینا اور اس کا از سر نو دولتمند بن جانا یا شہزادہ نیم روز کو لاکھوں جتن کے باوجود چودھویں سال کے اندر جنون ہو جانا۔

دوسری بات جو میرامن ناظرین کے ذہن نشین کرانا چاہتے ہیں یہ ہے کہ اس دنیا میں ظاہری انتظام کے علاوہ ایک مخفی اور باطنی انتظام بھی ہے جب کسی انسان کو پے در پے مشکلات کا سامنا ہوتا ہے وہ اُن سے تنگ آکر اپنے تئیں ہلاک کرنا چاہتا ہے تو کوئی بزرگ اور مقدس روح اس کی دستگیری کرتی اور اس کی مشکلات کا حل بتاتی ہے۔ جیسے ہر درویش کو حضرت علی مشکل کشا ہلاکت سے بچاتے ہیں۔ مولف ناظرین کو تیسری بات یہ بتانا چاہتا ہے کہ تم اپنے کیسے ہی اہم مقصد کی جستجو میں کیوں نہ مشغول ہو، اگر کوئی شخص تم سے زیادہ حاجت مند اور مضطرب ہے تو پہلے اس کا مطلب پورا کرنے میں اپنی ہمت صرف کردو۔ مولف اس امر کو وضاحت سے ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ دنیا میں بادشاہت اور حکومت کے بعد اگر کوئی چیز انسان کو عمدہ حالت میں رکھ سکتی ہے تو وہ تجارت ہی ہے اور تجارت بھی ایسی کہ ایک جگہ بیٹھ کر نہ کی جائے بلکہ وہ جس میں ملک ملک کی سیر و سیاحت اور عجائبات عالم کے مطالعہ کا موقع مل سکے۔ اس طرح کے عالمگیر مشاہدات سے زندگی کے نئے نئے طریقے معلوم ہوتے ہیں اور یہ عقل و علم کے بڑھانے کا نہایت مفید طریقہ ہے۔

قدیم قصوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ قصہ کے بیچ میں دوسرا قصہ آجاتا ہے اس سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے اور مولف کا مقصد ناظرین کو تھوڑی دیر انتظار میں رکھ کر ان کی دلبستگی بڑھانا ہوتا ہے۔ باغ و بہار میں بھی اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں مثلاً خواجہ سگ پرست کے قصہ میں

ملکہ سراندیپ اور سوداگر آذر بائیجان کے قصے آجاتے ہیں۔

قدیم داستان گوجب کسی میلے یا تماشے کا سین دکھاتے تو اس کے متعلق جتنے الفاظ اور اصطلاحیں ہوتی تھیں وہ سب ایک ساتھ بیان کر دیتے تھے۔ یہ خصوصیت "باغ و بہار" میں بھی پائی جاتی ہے مثلاً چوروں کی اقسام۔ خدمتگاروں کے مختلف درجے۔ دعوت کے لوازمات' روشنی کا سامان۔ آتش بازی کی چیزیں۔ خدمتگار عورتوں کے مختلف نام' ناچ اور گانے کی قسمیں وغیرہ نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں۔

"باغ و بہار" کے مطالعہ سے زمانہ قدیم کے طرز زندگی اور سماجی حالات کا بعینہ نقشہ آنکھوں کے سامنے کھچ جاتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بعض بادشاہ انتظام سلطنت اور صوبوں کی خبر گیری اور نگرانی کے لیے سال میں آٹھ مہینے دارالسلطنت سے باہر رہتے تھے اور بارش کا موسم پایۂ تخت میں گزارتے تھے شاہی محلوں میں مسلح عورتیں پہرہ دار ہوتی تھیں۔ اندر کا سارا انتظام ان کے سپرد ہوتا تھا ان کو قلما قنیاں اور اردا بیگنیاں کہتے تھے بادشاہ کے زیادہ معتبر ملازم حبشی غلام ہوتے تھے اور یہ لوگ عام طور پر وفادار سمجھے جاتے۔ تھے خواجہ سرا شاہی زنانخانہ کے محرم راز ہوتے تھے۔ شہزادیاں ان کو اپنے اسرار سے آگاہ کرتی اور ان سے وقتاً فوقتاً اپنے کاموں میں مدد لیتی تھیں۔ وہ عام طور پر شہزادیوں سے بے تکلف ہوتے تھے۔ اُن کے علاوہ انائیں اور دائیں بھی شہزادیوں کے رازوں سے واقف ہوتی تھیں اور اُن کے کام میں ہاتھ بٹاتی تھیں شہزادیاں

پڑھی لکھی اور بہت سی مردانہ کمالات سے بہرہ اندوز ہوتی تھیں باورچی خانہ کی نگرانی اکثر شہزادیوں کے سپرد ہوتی اور خصوصاً دعوت اور مہمانداری کے موقعوں پر کھانوں کی دیکھ بھال اور لوازمات کی ترتیب بذات خود کیا کرتی تھیں۔ اُس وقت وہ معمولی اور سادہ لباس زیب تن کرتی تھیں شہزادیوں اور اعلیٰ طبقہ کی امیرزادیوں میں پردہ کا کچھ رواج نہ تھا۔ وہ اپنی طرزِ معاشرت میں بہت کچھ آزاد ہوتی تھیں اور اپنی پسند کے موافق اپنے لیے شوہر انتخاب کرتی تھیں۔ عورتوں سے محلات میں جاسوسی کا بھی کام لیا جاتا تھا اور سنگین جرایم کے انکشاف اور خصوصاً محلات کے معاملات میں اُن سے بڑی مدد ملتی تھی۔

عام طور پر لوگ مہمان نواز ہوتے تھے۔ مسافروں اور مہمانوں کو تین دن تک اپنے ہاں اصرار سے رکھتے اور ان کی دل جوئی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھتے تھے۔ مسلمانوں کا امیر طبقہ شراب سے محترز نہ تھا۔ گانے بجانے کی محفلیں بے تکلف ہوا کرتی تھیں اور گانے ناچنے والی لڑکیاں زرق برق لباس پہن کر محفلوں میں گاتی اور ناچتی تھیں اکثر میزبان اپنے بے تکلف مہمانوں کو محفل کی مناسبت سے جوڑا بدلواتے اور ہر امیر گھرانے میں ایسے موقعوں کے لیے متعدد پوشاکیں بنی رہتی تھیں۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کے مذہبی اعتقادات نہایت پختہ تھے جب کبھی موقع ملتا سوداگر اور سیاح غیر مذہب والوں کو بے تکلف اپنے دین کی تلقین کرتے تھے۔ غیر قوم کی عورتوں سے شادی بیاہ کرنے اور انہیں اپنے مذہب میں شامل کرنے کا

رواج بہت عام تھا۔ خاص و عام دونوں جادو اور نجوم کے بڑے قائل تھے۔
جب کسی امیر کے گھر بچہ پیدا ہوتا تو فوراً نجومیوں کو بلوا کر اس کا زائچہ بنوایا
جاتا اور اس کی آیندہ زندگی کا حال دریافت ہوتا۔ نجومیوں کی ہدایات
کے موافق بچوں کی پرورش اور نگہداشت کی جاتی تھی۔ لاعلاج امراض
میں انہی سے رجوع کیا جاتا اور اکثر طبیبوں کے ساتھ عامل اور سیانوں سے
بھی مشورہ کیا جاتا۔ ان کے حسبِ ہدایات گنڈے تعویذ باندھے جاتے
اور صدقہ خیرات دی جاتی۔ غرض زندگی کے ہر اہم کام جیسے شادی بیاہ،
تعمیر مکان، سیر و سیاحت کے موقعوں پر عاملوں سے مشورے لیے جاتے
اور مبارک ساعت اور سبھ لگن دریافت کی جاتی۔ مسلمان سفر پر جاتے وقت
امام ضامنؓ کا روپیہ بازو پر باندھتے اور سفر سے واپس آنے پر عورتیں
تیل ماش اور ٹکے اُتارتی تھیں۔ خارق عادت اور عجیب و غریب
چیزوں سے بڑی دلچسپی کا اظہار ہوتا تھا۔ سادھوؤں اور تارک الدنیا
درویشوں کے متعلق عام اعتقاد یہ تھا کہ وہ مشکلات و مصائب کے
وقت دستگیری اور لاعلاج امراض کا علاج کرتے ہیں۔ کامل درویشوں
کی نسبت یہ یقین تھا کہ کیسی ہی تیز ہوا چلے ان کا چراغ گل نہیں ہوتا۔
غرض "باغ و بہار" اس زمانہ کی طرزِ معاشرت، شادی، بیاہ،
موت و حیات وغیرہ کے رسم و رواج اور عوام النّاس کے معتقدات
اور اوہام وغیرہ کا ایک صحیح مرقع ہے اور سماجی زندگی کے مظہر افسانوں میں
اس کو ایک تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

گنج خوبی

یہ میر امن کا دوسرا مگر بالکل غیر معروف کارنامہ ہے اس کا صرف نام ہی نام سنا جاتا تھا مگر کہیں اس کی تفصیل نظر سے نہیں گزری اور نہ یورپ کے کسی کتب خانہ میں اس کے قلمی یا مطبوعہ نسخے کا پتہ چلا۔ حُسنِ اتفاق سے ہمیں کتب خانہ آصفیہ میں ایک پُرانا اور بوسیدہ نسخہ ۱۲۹۲ھ کا مطبوعہ ملا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باغ و بہار کی تالیف کے بعد میر امن نے اس پر قلم اٹھایا۔ یہ بھی ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے لکھی گئی ہے۔ یہ ملا حسین الواعظ کاشفی کی شہرۂ آفاق کتاب "اخلاق محسنی" کا ترجمہ ہے ملا حسین کاشفی فارسی کے مشہور اور مقبول مصنف ہیں۔ ان کی انوار سہیلی اور اخلاق محسنی سے ہر فارسی داں آشنا ہو۔ کاشفی نے تفسیر حسینی کے نام سے فارسی میں کلام اللہ کی ایک تفسیر بھی لکھی ہے۔ اخلاق محسنی اخلاقیات کی نہایت مقبول کتاب ہے اور میر امن نے اردو میں اس کا ترجمہ کر کے اُردو کی نہایت عمدہ خدمت انجام دی ہے۔ اس کی تاریخ تالیف و نام کے متعلق خود اُن کا بیان حسب ذیل ہو:-

> "سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سو دو عیسوی کے "باغ و بہار" کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔ از بس کہ جتنی خوبیاں انسان کو چاہئیں اور دنیا کی نیک نامی اور خوش معاشی کے لئے درکار ہیں سو سب اس میں بیان ہوئیں اس واسطے اس کا نام "گنج خوبی" رکھا۔

میر امن نے اس کے ترجمہ میں بھی جدت سے کام لیا ہے اور گو اس میں

وہ آزادی نہیں برتی جو "باغ و بہار" میں ہے تاہم اس کا ترجمہ بھی نہایت آزاد ہے اور لفظی پابندی نہیں کی گئی ہے چنانچہ اس بارہ میں خود لکھتے ہیں۔

"لیکن فقط فارسی کے ہو بہو معنی کہنے میں کچھ لطف اور مزہ نہ دیکھا اس لیے اس کا مطلب لے کر اپنے محاورہ میں سارا احوال بیان کیا۔"

اس کتاب میں چونکہ اخلاقی نصائح اور ان کے ضمن میں حکایتیں دی ہیں اس لئے میرامن نے بھی کتاب کی نوعیت کا لحاظ کر کے سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا بلکہ روزمرہ کے ساتھ اخلاقی کتابوں کی متانت بھی باقی رکھی ہے اور یہی ایک خوبی ایسی ہے جس نے ان کو اس ترجمہ میں کامیاب بنایا۔ ذیل میں اس کا ایک مختصر سا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے اس کتاب کی زبان اور طرز بیان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

"کہتے ہیں کہ ایک بزرگ نے جب اپنی زندگی کی امانت اجل کے فرشتے کو سونپی اور اسباب اپنی ہستی کا اس سرائے فانی سے منزل باقی میں پہنچایا کسو شخص نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا کہو مرنے کے بعد تم پر کیا کیا واردات گزری۔ اور اب کیا حال ہے؟ جواب دیا کہ ایک مدت تئیں عذاب کے عقاب کے پنجے میں اور سختی کے شاہین کے چنگل میں گرفتار تھا ایک بارگی کریم کے کرم سے اس حالت سے چھٹکارا ہوا اور سارے گناہ معاف ہو گئے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ اس کا کیا سبب اور باعث ہے؟ کچھ تمہیں معلوم ہو تو بیان کرو کہ کس کے وسیلہ سے نجات پائی۔ بولے

کہ ایک میدان میں مسافرخانہ بنایا تھا۔ شاید کوئی غریب راہ چلتا
جیٹھ کے دنوں دوپہر کی دھوپ میں تونسا ہوا اس کے سایہ میں
آن کر بیٹھا اس نے کوئی دم آرام پایا۔ جب ٹھنڈی ہوا اور راہ کی
ماندگی سے ہرا ہوا خوش ہو کر نہایت عاجزی سے بدل دُعا کی کہ
اے بارالٰہا! اس مکان کے بنا کرنے والے کے گناہ بخش اور
اس کی روح کو فردوس کی چھانوں میں جگہ دے۔ وہیں اس کی
دُعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر درست بیٹھا۔ میری آمرزش
ہوئی۔ اور جہنم کے گڑھے سے نکال کر بہشت کے غرفہ میں رہنے کا
حکم ہوا۔ بیت

ہر چند کہ سب کاموں میں غور کروں ہوں — نیکی ہی بھلی سب میں اور باقی ہے سب پوچ

(گنج خوبی مطبوعہ مطبع محبوب بمبئی ۱۲۹۲ھ ص ۸۴)
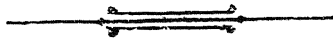
سیّد حیدر بخش حیدری

سید حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف اور بہت مشہور اہل قلم ہیں۔ ان کی ولادت دہلی میں ہوئی مگر سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے والد کا نام سید ابو الحسن ہے۔ ان کے آبا و اجداد زمانۂ قدیم میں اپنے وطن نجف اشرف سے ہندوستان آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کی۔ ایک زمانہ دہلی میں گزارنے کے بعد گردش زمانہ نے سید ابو الحسن کو فکر معاش سے اس قدر تنگ کر دیا کہ انہیں بالآخر اپنے وطن دہلی کو خیرباد کہنا پڑا۔ وہ لالہ سکھ دیو رائے کی معیت میں دہلی سے نکلے اور بنارس میں جا رہے۔

گو اس وقت دہلی کے باغ ادب میں پت جھڑ شروع ہو چکی تھی پھر بھی خال خال لوگ ایسے موجود تھے جن پر دہلی کو بجا ناز تھا اور اس گئی گزری حالت میں بھی وہاں کے باکمال اور ارباب فن کا دم غنیمت تھا ان کی صحبتیں اور جلسے عہد اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتے تھے۔ حیدر بخش کے لیے دہلی کی سکونت کا ترک کرنا بہ ظاہر ایک بڑی بدقسمتی تھا کیونکہ دوسرے کسی شہر میں وہ عالمانہ صحبتیں اور علمی چرچے جو دہلی میں تھے مل نہیں سکتے تھے۔ مگر خدا کی عنایت شامل حال تھی کہ بنارس سے شہر میں بھی ان کو اعلیٰ ادبی تعلیم حاصل کرنے اور ارباب کمال کی صحبتوں سے

فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔

اتفاق سے نواب علی ابراہیم خاں خلیل لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں بنارس کے ناظم عدالت مقرر ہوئے وہ پٹنہ کے باشندے تھے اور فارسی زبان پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔ اُن کی تصانیف کی تعداد بہت زیادہ ہے انھوں نے شعر و شاعری کا اعلیٰ مذاق پایا تھا اور اپنے زمانہ کے عمدہ اور ممتاز شعرا میں گنے جاتے تھے[1] بنارس میں ابوالحسن کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے لیے خوش نصیبی سے ایسا لائق شخص مل گیا۔ چنانچہ حیدر بخش اُن کے سپرد کیے گئے اُن کے فیض تربیت سے بہت جلد علوم متعارفہ میں مہارت بہم پہنچائی اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیات کی باریکیوں اور شعر و شاعری کی لطافتوں سے بھی واقف ہونے کا موقع مل گیا۔ خلیل نے ان کو قاضی عبدالرشید نام ایک عالم کے تحت کسی خدمت پر مامور بھی کردیا۔ قاضی صاحب ایک عالم متبحر تھے اُن کے تحت رہ کر حیدری نے بہت جلد عربی اور فارسی ادب پر عبور حاصل کرلیا اس کے علاوہ مذہبی علوم مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر و سیر کی تعلیم مولوی غلام حسین غازی پوری سے پائی۔ مولوی صاحب موصوف علی ابراہیم خاں کے ماتحت عدالت میں کسی خدمت پر مامور تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے لیے ڈاکٹر گل کرسٹ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لائق اہل قلم اور اردو کے انشاء پردازوں کو کلکتہ میں جمع

---

[1] خلیل کا مفصل تذکرہ مرزا علی لطف کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

کرنے لگے تو اس سلسلہ میں حیدری نے بھی کلکتہ کا رُخ کیا اور تقریب سفر کے طور پر ایک کتاب "قصہ مہر وماہ" کے نام سے مرتب کی اور اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کی خوبی مطالب اور طرز بیان کی سلاست وصفائی کو بے حد پسند کیا اور حیدر بخش کو منشیاں کالج کے زمرہ میں ملازم رکھ لیا۔ کالج میں ملازم ہونے کے بعد سے حیدر بخش ایک عرصہ تک فکر معاش سے آزاد ہو گئے اور خالص علمی زندگی شروع کی اور آخری دم تک تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔

حیدر بخش کے متعلق تذکرہ نویسوں نے کچھ بھی نہیں لکھا ہے ان کے معاصرین کے تذکرے بھی ان کے حالات سے خالی ہیں البتہ عبدالغفور خاں نساخ نے صرف اتنا ذکر کیا ہے "حیدری تخلص۔ حیدر بخش دہلوی ۱۲۱۶ھ میں کلکتہ میں تھے۔ ان کی آرائش محفل یعنے ہفت سیر حاتم نظر سے گزری[1]" اور اس کے بعد ان کا یہ شعر نقل کر دیا ہے۔

برابری کا تری گل نے جب خیال کیا[2] صبا نے مار طمانچہ منہ اس کا لال کیا

تذکرہ نویسوں کی بے اعتنائی سے ان کے حالات زندگی پردۂ خفا میں رہے۔ اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ خود ان کی تصانیف کے دیباچوں وغیرہ سے ماخوذ ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج

---

[1] سخن شعرا: نساخ ص۔ [2] یہ شعر سودا کا ہے، دیکھئے آب حیات ص ۶۷، صرف دوسرے مصرع میں "طمانچہ" کی بجائے "تھپیڑا" ہے۔

میں کب تک ملازم رہے اور کس سنہ میں وہاں سے علیحدہ ہوئے اتفاق سے تذکرہ ریاض الوفاق مولفہ ذوالفقار علی مست میں جو ۱۲۲۹ھ میں لکھا گیا ہے اور جس میں کلکتہ اور بنارس کے فارسی گو شعرا کے حالات بیان کیے گئے ہیں حیدری کے متعلق دو فقرے نظر پڑے۔ مست کا بیان ہے کہ "حیدری ۱۲۲۹ھ میں بنارس میں تھے اور وہ کچھ عرصہ تک فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے"، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدر بخش ۱۲۲۹ھ سے بہت پہلے فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے اور اس کے بعد وہ بنارس چلے گئے تھے جس کو انھوں نے اپنا وطن بنا لیا تھا ان کی تاریخ وفات بھی صرف ایک زبانی بیان کی بنا پر ۱۸۲۳ء قرار دی جاتی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے منشی غلام حیدر کی زبانی یہ روایت لکھی ہے کہ ان کے دوست حیدر بخش نے سنہ مذکور میں وفات پائی۔ منشی غلام حیدر، حیدر بخش کے دوست اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے چونکہ ان کے بیان کے علاوہ اور کوئی اطلاع نہیں ہے اس وقت یہی سنہ قابل قبول ہے۔

اب ہم ان کے حالات سے قطع نظر کرکے ان کی تالیفات پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں ان کی دس گیارہ کتابوں کا پتہ چلتا ہے ان میں سے جو کتابیں ہمیں دستیاب ہوی ہیں ان کی تعداد صرف تین ہے حیدر بخش حیدری نظم و نثر دونوں پر قدرت بلیغ رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کا کلام کلیات یا دیوان کی صورت میں شایع نہیں ہوا ہے مگر متفرق

طور پر جو نظمیں اور غزلیں دستیاب ہوی ہیں ان سے ان کے جملہ کلام کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی کوئی خاص خصوصیت نہیں کہ ہم ان کو اپنے زمانہ کے شعرا میں کسی ممتاز جگہ کا مستحق سمجھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے کلام میں سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور سارے کلام میں ایک قسم کی ہمواری ہے کسی خاص صنف ہی ان زور کلام بڑھا ہوا اور دوسری صنف میں گھٹا ہوا نہیں پایا جاتا۔ ان کی شہرت اور مقبولیت بھی شاعری کی بدولت نہیں ہے بلکہ ان کے نثری کارناموں نے انہیں اردو ادبیات میں ایک خاص رتبہ بخشا ہے۔ ان کے یہی کارنامے اب اور آئندہ ان کے نام کو زندہ رکھنے والے ہیں ان کا دیوان تو شایع نہیں ہوا اور نہ ہمیں کوئی قلمی نسخہ حاصل ہو سکا مگر ان کی "گل مغفرت" میں بھی مرثیوں، غزلوں اور نوحوں کا ایک بڑا حصہ موجود ہے۔ ذیل میں اس سے تھوڑا سا کلام نمونتاً نقل کیا جاتا ہے:-

تیری فرقت میں زمین و آسمان نے رو دیا — سینہ و دل شق ہوے روح رواں نے رو دیا

اے حسینؑ ابن علیؑ! کر یاد تری تشنہ لبی — کوہ کی چھاتی پھٹی آب رواں نے رو دیا

کن فکاں قالب ہے تو اس میں ہے جوں روح رواں — اس الم میں کیا کہوں میں کن فکاں نے رو دیا

کچھ ہمیں اہل زمیں ماتم نہیں کرتے ترا — سر دھنا رضواں نے اور باغ جناں نے رو دیا

دے بہائے چشم تر ماتم میں اس کے خون دل — قدسیوں نے جس کے غم میں ہو پریشاں رو دیا

آدم و نوح و خلیل و موسیٰ و عیسیٰ نے آہ — غم کیا۔ جبرئیل حق کے راز داں نے رو دیا

اہل بیت مصطفےٰ یاں تک ہوئے گریہ کناں — سنگ خارا بہہ چلا، ہر انس و جاں نے رو دیا

دیکھ کر رونا سکینہ کا کہوں کیا دوستو! — لڑکیوں نے غم کیا، پیر و جواں نے رو دیا

حیدری آل عبا کی بے کسی پر کیا کہوں — دشت صحرا جل بجھے۔ کوہ گراں نے رو دیا

آج ہے دسویں محرم کی کہوں کیا ماجرا — سید اطہرؓ کا سر دشت بلا میں کٹ گیا

ہو گیا خورشید تاباں آج گردوں پہ سیاہ — دیکھ کر شبیر کا نوک سناں پر سر چڑھا

چرخ لے کر منہ پہ اپنے چادر ابر سیاہ — تشنگی شبیر کی کر یاد خوں رونے لگا

بہہ گئے پانی ہو پربت شعلۂ شبیر سے — رہ گئے اس غم میں دریا اپنی آنکھیں ڈبڈبا

نے رکھے گلشن میں گل نے بن میں رکھے خار و خس — خشک و تر اس آتش غم نے دیئے دونوں جلا

شہسوار لافتا ہو جس کا بابا کیا کہوں — ہے غضب! بیٹا ہو اس کا سر برہنہ پیادہ پا

آیت تطہیر جس کی شان میں نازل ہو آہ — اس کا کنبہ اونٹ پر بلوے میں سر ہووے کھلا

اہل بیت مصطفےٰ کو ظلم سے کردیں تباہ — ہے غضب! کربل میں اس کو اشقیائے دیں جلا

کیا لکھوں آل عبا کا حال زار اے حیدری — ہو گیا ٹکڑے جگر۔ منہ کو کلیجا آ رہا

حیدر بخش کی غالباً پہلی تالیف "قصہ مہر و ماہ" ہے یہ کتاب انھوں نے اوائل ۱۲۱۴ھ میں لکھی اور اسی کو پیش کر کے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں بار یاب اور فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے ان کی دوسری کتاب "قصہ لیلیٰ و مجنوں" ہے یہ حضرت امیر خسروؒ کی فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۲۱۶ھ میں تمام ہوا ہم کو یہ دونوں کتابیں نہ مل سکیں اس لیے ہم ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں بیان کر سکتے۔

طوطا کہانی

ان کی تیسری اور معرکۃ الآرا کتاب طوطا کہانی ہے بعض قلمی نسخوں میں اس کو توتا کہانی بھی لکھا ہے۔ غالباً یہ کاتبوں کی غلطی ہے۔ سنسکرت زبان میں زمانہ قدیم میں ایک کتاب "شکا سپتتی"

تصنیف ہوئی تھی۔ شکا سپ تتی کے معنی "طوطے کی کہی ہوئی ستر کہانیاں"
ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں آباد ہو کر یہاں کی ادبیات اور دیگر
علم و فن کی کتابوں کو اپنی زبان یعنے فارسی میں منتقل کرنا شروع کیا اور
سنسکرت اور ہندی کی بیسیوں کتابیں فارسی میں ترجمہ کر ڈالیں۔ ان میں
سے ایک کتاب یہ بھی ہے اس کو اولاً مولانا ضیاء الدین نخشبی نے سنہ ۷۳۰ھ م ۱۳۳۰ء
میں فارسی میں ترجمہ کیا تھا مگر بجائے ستر قصوں کے صرف باون قصّوں کو
لے لیا اور ان کے فارسی ترجمہ کا نام طوطی نامہ رکھا۔ مولانا ضیاء الدین نخشبی
اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم اور فارسی کے بلند پایہ مصنف تھے ان کا وطن
بدایون ہے اور وہ ۷۵۱ھ میں فوت ہوئے طوطی نامہ کے علاوہ سالک السلوک،
عشرہ مبشرہ کلیات و جزئیات ان کی مشہور و مقبول عام تصانیف ہیں [1]
مولانا نخشبی کے طوطی نامہ کی زبان نہایت مشکل اور ادق تھی مگر اس کے باوجود
اس کو کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اس کے بعد فارسی ہی میں اس کے
متعدد خلاصے ہوئے۔ ان میں سے دو خاص طور پر مشہور ہیں۔ ایک
شیخ ابو الفضل کا جو دسویں صدی کے وسط میں لکھا گیا اور دوسرا
ملا سید محمدؐ قادری کا۔ آخر الذکر کے خلاصہ کو بھی بہت شہرت حاصل ہوئی
اور حیدری نے جیسا کہ اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے اسی سے اردو ترجمہ
کیا ہے۔ حیدری سے بہت پہلے کسی شخص نے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا۔
سنہ ۱۱۴۲ھ میں اس خلاصہ کو دکھنی زبان میں ترجمہ کیا تھا اس کا ایک قلمی نسخہ

---

[1] اردوئے قدیم از مولوی سید شمس اللہ قادری حیدر آبادی ص ۱۱۵

کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں اور ایک برٹش میوزیم میں موجود ہے۔ حیدری نے ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے طوطی نامہ کا ترجمہ کر کے اس کو طوطا کہانی کے نام سے موسوم کیا۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"یہ سید حیدر بخش متخلص بہ حیدری شاہجہان آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم شاگرد غلام حسین خاں غازی پوری دست گرفتہ صاحب عالیجناب سخنداں .... صاحب والا شان جان گل گرسٹ بہادر دام اقبالہ کا ہے۔ اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے لیکن بہ موجب فرمایش صاحب موصوف کے ۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء کے .... محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشبی ہے زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوے معلیٰ کے عبارت سلیس و خوب، الفاظ رنگین و مرغوب میں ترجمہ کیا اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا"

ملا محمد قادری نے مولانا نخشبی کے طوطی نامہ سے صرف (۳۵) قصوں کو انتخاب کر کے ان کا خلاصہ کیا تھا چنانچہ حیدری کی طوطا کہانی میں بھی اتنے ہی قصے ہیں طوطا کہانی کا ایک طویل اقتباس سب سے پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ نے "بیاض ہندی" میں شایع کیا۔ پوری کتاب پہلی مرتبہ کالج کی طرف سے نہایت اہتمام کے ساتھ ۱۸۰۴ء میں شایع ہوی اور کالج کے نصاب میں شریک کر لی گئی۔ حیدری کے اس کارنامہ کو بے حد مقبولیت حاصل ہوی اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن ہندوستان کے مختلف مطابع سے شایع

ہو چکے ہیں۔ ڈنکن فاربس نے ۱۸۵۳ء میں نہایت اہتمام کے ساتھ لندن سے ایک خوشنما ایڈیشن شایع کیا تھا اس میں متن کتاب کے تمام اہم و مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہے۔ علاوہ ازیں جی اسمال نامی ایک انگریز نے اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس دیا جاتا ہے:—

"جب سورج چھپا اور چاند نکلا خجستہ با سینۂ پر سوز چشم گریاں آہیں بھرتی ہوئی طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی اے سبز پوش طوطے میں عشق کے غم سے موئی جاتی ہوں اور ہر ایک شب میری نصیحت اور گفتگو میں کھو دیتا ہے

فرد نصیحت کی باتیں نہ مجھ کو سنا میں عاشق ہوں مجھ کو نصیحت سے کیا

طوطا کہنے لگا اے خجستہ یہ کیا کہتی ہو۔ دوستوں کی بات ماننا چاہئے کیونکہ جو کہنا دوستوں کا نہیں مانتا خراب ہوتا ہے اور پشیمانی کھینچتا ہے جس طرح سے ایک شخص نے دوست کا کہنا نہ مانا اور پشیمان ہوا خجستہ نے کہا میرے اچھے طوطے میں تیرے صدقے وہ کونسی نقل ہے بیان کر طوطا بولا کہ کسی شہر میں چار یار مال دار تھے اتفاقاً وہ چاروں مفلس ہو کر ایک حکیم کے پاس گئے اور ہر ایک نے اپنا اپنا احوال اس کے آگے ظاہر کیا۔ تب حکیم کو ان کے اوپر رحم آیا اور ایک ایک مہرہ حکمت کا ان چاروں کو دیکر کہا کہ یہ مہرہ ہر ایک اپنے اپنے سر پر رکھو اور چلے جاؤ جس کے سر کا مہرہ جس جگہ گرے وہ اس جگہ کو کھودے جو اس میں نکلے وہ اس کا حق ہے آخر وہ چاروں ہر ایک مہرہ اپنے سر پر رکھ کر ایک طرف کو چلے۔ جب کئی

کوس گئے ایک کے سر کا مہرہ گرا اس نے اس جگہ کو کھودا تو تانبا نکلا اس نے
ان تینوں سے کہا کہ میں اس تانبے کو سونے سے بہتر سمجھتا ہوں اگر تمہارا
جی چاہے تو میرے ساتھ یہاں رہو انہوں نے کہنا اس کا نہ مانا اور آگے
بڑھے تھوڑی دور گئے تھے کہ وہ دوسرے کے سر کا مہرہ گرا اس نے جو زمین
کھودی تو روپیہ نکلا تب اس نے ان دونوں سے کہا کہ تم ہمارے پاس
رہو یہ روپا بہت ہے زندگی گزر جائیگی اس کو اپنا ہی سمجھو انہوں نے اس کا
کہنا نہ مانا اور آگے بڑھے کہ تیسرے کے سر کا مہرہ گرا اس نے بھی وہ
زمین کھودی تو سونا نکلا تب خوش ہو کر چوتھے سے کہنے لگا کہ اس سے
اب کوئی چیز بہتر نہیں جانتے ہیں کہ اب ہم تم یہیں رہیں اس نے کہا کہ
میں اگر جاؤنگا تو جواہر کی کان پاؤنگا یہاں کیا رہوں ۔ یہ کہہ کر آگے
چلا ۔ قریب ایک کوس کے پہنچا تب اس کا بھی مہرہ گرا اسی طرح جو اس نے
جگہ کھودی تو لوہا نکلا ۔ یہ حالت دیکھ کر نہایت شرمندہ ہوا اور اپنے جی میں
کہنے لگا کہ میں نے کیوں سونے کو چھوڑا اور اپنے یار کا کہنا نہ مانا سچ ہے

فرد سخن دوست کا جو نہیں مانتے وہ خاک پشیمانی ہیں چھانتے"

(طوطا کہانی مطبوعہ نول کشور پریس ص ۲۸)

طوطی نامہ نخشبی کے دو منظوم ترجمے ملا غواصی اور ابن نشاطی نے دکھنی میں کیے تھے یہ دونوں اردو کے بہت ہی قدیم شاعر اور سلطنت قطب شاہیہ گولکنڈہ کے متوسل تھے ۔ غواصی کا ترجمہ ۱۰۴۹ھ کا ہے اور ابن نشاطی کا ۱۰۶۶ھ میں مرتب ہوا ہے یہ دونوں ترجمے اردو شاعری کے ابتدائی نمونے ہیں

اور اس لحاظ سے خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

آرایش محفل حیدری کی دوسری مقبول اور مشہور کتاب "آرایش محفل" ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے سخن شعرا میں اس کا نام ہفت سیر حاتم بھی لکھا ہے اس میں حاتم طائی سے متعلق قصص کو مربوط اور مسلسل بیان کیا گیا ہے اور چونکہ اس کی سات سیریں بیان ہوی ہیں۔ نساخ کا بتایا ہوا دوسرا نام بھی موافق موضوع ہے یہ قصہ ابتداءً فارسی نثر میں تھا اس کو حیدری نے اوائل ۱۲۱۶ھ م ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے کہنے سے اردو کا جامہ پہنایا ہے یہ فارسی نثر کا نرا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مترجم نے اپنی طرف سے بہت سی باتوں کا اضافہ کیا ہے اور اصل کتاب میں متعدد ردو بدل کر کے قصہ کو زیادہ پرلطف بنایا اور اپنا لیا ہے۔ آرایش محفل کو اس لحاظ سے ترجمہ کہنے کی بجائے حیدری کی تالیف کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں "اس میں اپنی طبع کے موافق جہاں موقع پایا وہاں اور زیادہ کیا تاکہ قصہ طولانی ہو جائے سننے والے کو خوش آئے" مولف نے کتاب کے آخر میں حسب ذیل قطعہ تاریخ بھی لکھا ہے۔

اس قصۂ پرلطف کے اتمام کی تاریخ | میں دل میں سمجھتا تھا نہایت ہی مشکل
کر دور سر یاس کہا پیر خرد نے | کیوں کر نہ کہیں ہم اسے آرایش محفل
۱۲۱۶ھ

"آرایش محفل" تاریخ تالیف سے لے کر اب تک متعدد بار چھپ چکی ہے اور یہ اُس کے مقبول خاص و عام ہونے کی کافی دلیل ہے۔ آج کل دیگر قدیم قصص کی طرح اس کی طرف سے پبلک کی توجہ ہٹ چکی ہے مگر اس کی

تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے اس نے اور اس کے ساتھ کی دوسری کتابوں نے ہی اردو میں سلیس و سادہ عبادت میں تصنیف و تالیف کا شوق پیدا کرایا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے :-

"حسن بانو نے کہا کہ دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک شخص نے اپنے دروازہ پر لکھ کر لگا دیا ہے کہ نیکی کر اور دریا میں ڈال یہ کیا بھید ہے اور اس نے کیا نیکی کی ہے اس کی خبر لا۔ اس سخن کے سنتے ہی حاتم اٹھ کھڑا ہوا اور حسن بانو سے پوچھنے لگا کہ وہ شخص کون ہے اور کس طرف کو رہتا ہے حسن بانو نے کہا میں نے اپنی دائی سے سنا ہے کہ اس کی جگہ اُتر کی طرف ہے بس اتنی بات دریافت کر کے وہاں سے توکل بخدا چل نکلا۔ بعد ایک مدت کے کسی جنگل ہیبت ناک میں جا پہنچا اور شام کے وقت ایک درخت کے نیچے چپکا ہو کے بیٹھ رہا کہ اتنے میں ایک آواز سوزناک درد آلودہ ساتھ آہ و زاری کے کسی طرف سے اس کے کان میں ایسی پڑی کہ جس کے سنتے ہی آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور کلیجا جلنے لگا بے اختیار اپنے جی میں کہہ اٹھا کہ اے حاتم یہ بات جواں مردی سے دور ہے کہ ایک شخص بندۂ خدا کسی آفت میں گرفتار ہو کر رو دے تو اس کی آواز سن کر مدد نہ کرے اور اس کا احوال نہ پوچھے اس کلام کو دل میں ٹھہرا کر اس طرف کا راستہ پکڑا۔ تھوڑی دور گیا ہوگا کہ اس جگہ جا پہنچا کہ جہاں سے رونے کی آواز آتی تھی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک جوان خوبصورت سر خاک پر بیٹھا گوہر اشک چشمۂ چشم سے اپنے گل رخسار نازنین پر بہا رہا ہے اور آہیں پیچ سوز بھر بھر کر یہ قطعہ پڑھتا ہے۔ قطعہ ۱۱

ٹک سنے جو تمہیں میرے دل زار کا احوال جاؤں میں کہاں اور کہوں کس سے عزیز
اور کہہ بھی نہیں سکتا زباں ہو گئی ہے لال جو مجھ پہ گزرتی ہے رقم کر نہیں سکتا

حاتم نے کہا اے جوان دردمند ایسی کیا تجھ پر مشکل پڑی ہے جو اتنا حیران و پریشان ہے۔ اس نے کہا اے مسافر میں سوداگر ہوں اور یہاں سے بارہ کوس پر ایک شہر عالیشان ہے وہاں حارث نام ایک سوداگر نہایت عمدہ و مالدار رہتا ہے اور ایک لڑکی بھی پری پیکر رشک قمر رکھتا ہے اتفاقاً ایک دن میں کسی طرف سے پھرتا پھرتا کچھ مال سوداگری کا لے کر اس شہر میں جا نکلا۔ حارث کی حویلی کے نیچے مارے دھوپ کے بیٹھ گیا یکایک میری نظر کوٹھے کی طرف جو گئی تو ایک عورت نازنین مہ جبین نظر آئی۔ حالت میری تباہ ہو گئی تب اس شہر کے لوگوں سے پوچھا میں نے۔ یہ کون ہے اور یہ کس کی حویلی ہے انہوں نے کہا کہ یہ محل حارث کی بیٹی کا ہے اور وہ بڑا مالدار ہے میں نے پھر ان سے کہا کہ یہ لڑکی شوہر رکھتی ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس کا باپ اس کا بیاہ نہیں کر سکتا اور اس کا کچھ اس بات میں نہیں چلتا۔ یہ لڑکی اپنی شادی کرنے میں آپ مختار ہے اور یہ تین سوال رکھتی ہے جو کوئی اس کے سوال پورے کریگا اسی سے بیاہ کریگی۔ اس بات کے سنتے ہی میں اس کی ڈیوڑھی پر گیا۔ دربان نے خبر کی۔ اس نے مجھے اندر بلوایا اور ایک فرش پاکیزہ پر بٹھلا کر کہلا بھیجا کہ اگر تو اپنے عہد و پیمان پر قایم رہے تو میں اپنے سوالوں سے تجھے آگاہ کروں میں کہا فرمائیے دل و جان سے قبول کیا اس نے کہا اگر تو کہنا میرا کریگا تو میں تیری ہی ہو کر رہونگی اور جو یہ بھید نہ کھولیگا تو تجھے

اپنا ہی جانونگی۔ میں نے اس کو قبول کیا اور قول دیا۔ تب اس نے کہا
پہلا سوال یہ ہے میرا کہ قریب اس شہر کے ایک غار ہے وہاں آج تک
کوئی نہیں گیا اور معلوم نہیں کہ اس کی انتہا کہاں تک ہے۔ دوسرا یہ کہ
شب جمعہ کو ایک آواز جنگل سے آتی ہے کہ نہ کیا وہ کام میں نے جو آج کی
شب کام آتا میرے۔ تیسرا یہ ہے کہ وہ مہرہ جو سانپ کی پیٹھ پر ہے مجھے
لا دیوے۔ اس بات کے سنتے ہی اور بھی رہے سہے حواس میرے
گم ہو گئے۔ میں نے ٹک ایک پانوں کھینچا اس نے دست تظلم سے میرا مال
و اسباب و زر و جواہر لوٹ لیا اور مجھ کو بھی اپنے شہر سے نکال دیا میں
لاچار ہو کر اس جنگل میں آپڑا۔ ایک تو مال گیا دوسرے رسوا ہوا تیسرے
عشق کے تیر نے کلیجا چھلنی کر ڈالا ہمراہیوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں
فقیر ہو گیا۔" (آرایش محفل)

ہفت پیکر حیدری نے حضرت نظامی گنجوی رح کی مشہور فارسی مثنوی ہفت پیکر کی طرز پر اردو میں ایک مثنوی اسی نام (یعنی "ہفت پیکر") سے تصنیف کی ہے یہ ۱۲۲۰ھ م ۱۸۰۵ء میں تمام ہوئی۔
مرزا کاظم علی جوان نے اس کی تاریخ تصنیف اس مصرعہ سے نکالی ہے ع

جان تازہ ہفت پیکر یہ ہوی

جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ مثنوی شائع نہیں ہوی۔ اس مثنوی کا
ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں تھا۔ ہم کو اس کا کوئی نسخہ
نہیں ملا۔

تاریخ نادری حیدری نے "تاریخ نادری" کا بھی اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ تاریخی کتاب نادر شاہ کے خروج سے لے کر اس کے وفات ۱۱۶۰ھ تک کے مفصل حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور اس کو ابتدا از محمد مہدی ابن محمد نصیر استرآبادی نے فارسی میں تصنیف کیا تھا۔ مصنف نہ صرف نادر شاہ کا ہم عہد تھا بلکہ اس کا ملازم اور مقرب رہ چکا تھا اس نے اس میں جا بجا ایسے واقعات بیان کیے ہیں جن سے اس کے مقرب ہونے کا ثبوت ملتا ہے اس کتاب کا اصلی نام "تاریخ جہانگشائے نادری" ہے مگر وہ عام طور پر تاریخ نادری کے نام سے مشہور ہے اور حیدری نے بھی اپنے اردو ترجمہ کے لیے یہی عرف عام پسند کیا اصل فارسی کتاب تو طہران، تبریز اور بمبئی سے شائع ہو چکی ہے مگر بدقسمتی سے اردو ترجمہ کو اشاعت و طباعت نصیب نہ ہو سکی۔ حیدری نے اس کا ترجمہ ۱۲۲۵ھ میں تمام کیا ہے۔ یہ کتاب حیدری کا نہایت ہی قابل قدر کارنامہ ہے اردو زبان کا دامن اتنی مدت گزرنے کے بعد بھی ایسی علمی اور اہم کتابوں سے بہت کچھ خالی ہے۔

گل مغفرت ملا حسین الواعظ کاشفی نے جن کی انوار سہیلی اور اخلاق محسنی سے ہر شخص واقف ہے شہدائے اسلام کے حالات پر ایک کتاب روضۃ الشہدا تصنیف کی تھی۔ حیدری نے "گلشن شہیداں" کے نام سے اس کو اردو میں منتقل کیا۔ پھر "گل مغفرت" کے نام سے ایک انتخاب مرتب کیا یہ کتاب صرف شہدائے کربلاؑ کے حالات پر مشتمل ہے اور اس کو انہوں نے اپنے مذہبی اعتقادات اور محبت اہل بیتؑ کی

بنا پر ۱۲۲۷ھ میں اپنے ایک دوست کی تحریک پر ترتیب دیا ہے مگر اس میں اپنی طرف سے جا بجا نظم و نثر کے اضافے اس قدر کر دئے ہیں کہ گویا وہ ان کی مستقل تالیف بن گئی اس کی تاریخ تالیف اور وجہ تسمیہ خود انھوں نے اس طرح بیان کی ہے :-

"صاحبان در دو غم و مبتلایان رنج و الم پر ظاہر و ہویدا ہووے کہ اس حیدر بخش حیدری کی کتاب گلشن شہیداں ہے جس کو پہلے روضۃ الشہدا سے زبان ریختہ میں ترجمہ کر چکا تھا اب شہر محرم الحرام کی بیسویں تاریخ سن بارہ سو ستائیس ہجری میں جناب فیض مآب .... مولوی سید حسین علی صاحب جونپوری زاد الطافہ کے ارشاد کرنے سے جن کی خدمت فیض درجت میں اس ہیچمدان کو ایک رسوخ دلی و نیاز باطنی ہے اس نسخہ دہ مجلس کو انتخاب کیا اور نام اس کا "گل مغفرت" رکھا اس لیے کہ ہر ایک خاص و عام کی نظر اشرف سے گزرے مقبول خاطر ہووے بحق محمد و آلہ الامجاد"

روضۃ الشہدا کی طرز پر جتنی بھی کتابیں لکھی گئیں انھیں عموماً دہ مجلس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کیونکہ عام طور پر عشرۂ محرم میں خوش عقیدہ مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر روزانہ دہ مجلس کا ایک حصہ سنا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ گل مغفرت کو بھی "دہ مجلس حیدری" کا نام دیا گیا مگر اس میں دس مجلسوں کی بجائے بارہ مجلسیں ہیں اور بارہویں مجلس میں تین اور ذیلی مجلسیں حضرت امام حسینؓ کے پھول، دسویں اور چالیسویں کی بھی ہیں۔ حیدری محبت اہل بیت میں شرابور تھے اور "گل مغفرت" ان کی محبت اور جوش عقیدت کی ایک

روشن دلیل ہے۔ شہادت کے واقعات بہت درد انگیز اور رقت آمیز طریقہ پر بیان کرنے کے علاوہ ہر مجلس کے آخر میں ان بزرگ پر اپنی طرف سے ایک نوحہ لکھا ہے نیز جا بجا الم انگیز نظمیں۔ رباعیاں اور قطعے وغیرہ بھی دیے ہیں۔ مجالس ماہ عزا کے لیے اردو میں بیسیوں کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں گل مغفرت خاص اہمیت رکھتی ہے۔ طرز ادا اور صفائی بیان کے لحاظ سے اس کو شہادت کی بہت سی کتابوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اس میں جو روایات بیان کی گئی ہیں ان کے متعلق اس وقت کچھ لکھنا ہمارے بحث سے خارج ہے البتہ ہم اتنا کہہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ روایات کو درایت کے اصول پر نہیں جانچا گیا اور جوش عقیدت میں وہی روایتیں درج کتاب کر لی گئیں جو عام طور پر مشہور ہیں۔ پھر بھی حیدری نے مولف "عناصر الشہادتین" کی طرح جا و بے جا روایات کا طومار نہیں باندھا بلکہ ہر چیز کے متعلق جو روایت معتبر و مقبول معلوم ہوی اسی کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ کتاب بہت بڑی حد تک بے جا زوائد سے پاک ہے۔

"گل مغفرت" ۱۲۲۷ھ م ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے شائع ہوی اور محبان اہل بیت نے ہاتھوں ہاتھ لی۔ اس کے بعد دو تین ایڈیشن اور شائع ہوئے۔ ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ ہم کو اپنے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب حیدر آبادی کے کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے اور بمبئی کے مطبع حیدری میں ۱۲۸۰ھ میں چھپا ہے۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ باوجود سعی بلیغ کے کوئی اور نسخہ نہ مل سکا اور نہ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں

ہی میں اس کے نسخے محفوظ ہیں۔ ایک فرانسیسی شخص برٹ ریاں نامی نے فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کرکے ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع کیا تھا کتاب کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"کتاب ایوان الرضا میں یوں لکھا ہے کہ اے اہل بیت رسالت کے ہوا خواہو۔ وائے آل عبا کے ماتم دارو! ماہ محرم میں گریہ وزاری کرو خوشی وخرمی کو دل میں راہ نہ دو۔ حق تعالیٰ اس رونے اور غم کرنے کا اجر عظیم دے گا۔ بہشت بریں سا مکان عطا فرمائیگا۔ کہتے ہیں کہ عمرو بن لیث خراسان کے بادشاہ کا ہمیشہ سے یہ معمول و دستور تھا کہ جب کوئی امیر سو سوار مکمل و مسلح اپنے ساتھ لاکر موجودات دیتا ایک گرز طلائی سے سرفراز ہوتا۔ ایک دن اس کے لشکر کی نظر ثانی ہوی۔ ایک سو چوبیس سردار صاحب گرز شمار کیے گئے۔ عمرو لیث اس فوج کو دیکھ کر یہاں تلک رویا کہ غش کھا گیا۔ جب ہوش میں آیا ایک وزیر نے ہاتھ جوڑ کر پوچھا اے بادشاہ تجھے کیا ہوگیا۔ ایسا کیا حادثہ تجھ پر پڑا۔ اس نے کہا کہ اے وزیر نیک تدبیر یہ فوج دریا موج دیکھ کر میں نے جناب امام حسین علیہ السلام کو یاد کیا اور جی میں یہ گزرا کہ اگر اس لشکر فتح پیکر سے جناب سید الشہدا رضہ کے ساتھ کربلائے معلیٰ میں ہوتا تو ان کافروں بد نہادوں کو مارتا۔ آپ کے ساتھ فتح و نصرت سے پھرتا۔ حاصل کلام وہ نیک انجام بعد تھوڑے دنوں کے مر گیا۔ شب کے وقت کسی شخص نے اُسے خواب میں دیکھا کہ

ایک تاج مرصع سر پر دھرے خلعت شاہانہ پہنے کارچوبی پٹکا کمر میں باندھے ہوئے حور و غلماں اپنے ساتھ لیے ہوئے ایک اسپ خوش خرام پر سوار ہے اور بہشت بریں کی سیر کرتا پھرتا ہے پوچھا اس نے کہا کہ اے شخص پہلے میں غضب الٰہی میں گرفتار ہوا تھا بعد اس کے حضرت امام حسین علیہ السلام کا غم والم یاد کرنے اور آپ کے حال زار پر رونے کے صدقہ سے بخشا گیا۔ یقین ہے کہ جو کوئی آپ کے ماتم میں شریک ہوگا اور آپ کا رنج والم یاد کر کے روئیگا یہ گریہ وزاری حشر کے دن اس کے کام آویگی۔ موجب نجات کا ہوگا" (ص ۱۳۷ گل مغفرت)

گلزار دانش

حیدری کا ایک اور کارنامہ "گلزار دانش" ہے یہ شیخ عنایت اللہ کی مشہور فارسی کتاب "بہار دانش" کا اردو ترجمہ ہے۔ ہم کو اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا اور نہ ہم یہ بتا سکتے ہیں کہ حیدری نے یہ ترجمہ کس سنہ میں تمام کیا۔ عنایت اللہ کی بہار دانش کئی سو صفحات کا ایک نیم تاریخی قصہ ہے اور اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے معاشقہ اور جہاندار شاہ کی مہموں اور مبارز طلبیوں کو بالتفصیل بیان کیا گیا ہے اس کا سنہ تالیف ۱۰۶۱ھ ہے اور مولف نے دیباچہ میں اس امر کا اظہار کیا ہے کہ یہ قصہ اس کی اپنی ایجاد یا اختراع پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس نے کسی نوجوان برہمن کی زبانی یہ حسن وعشق کی کہانی سنی تھی جس کو اس نے فارسی میں تالیف کر دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر اصل فارسی تالیف کا ایک قلمی نسخہ ۱۲۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے اور یہ بھی مولوی

عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے حاصل ہوا۔ مگر افسوس ہے کہ حیدری کا ترجمہ نہیں ملا۔ جہاں تک ہم کو معلوم ہے یہ طبع نہیں ہوا۔ حیدری کے بعض دوسرے کارناموں کی طرح اس کو کچھ زیادہ شہرت بھی نصیب نہ ہوئی۔ یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں ممکن ہے کہ کسی کے خانگی کتاب خانہ میں اس کا ایک آدھ نسخہ محفوظ ہو۔ بہار دانش کو مرزا جان طپش نے مثنوی سحر البیان کی طرز پر اردو میں منظوم کیا ہے اور یہ مثنوی شائع اور مقبول ہو چکی ہے اس کا مفصل ذکر طپش کے سلسلہ میں کیا جائیگا۔

گلدستۂ حیدری

حیدری نے مذکورۂ بالا کتابوں کے علاوہ "گلدستۂ حیدری" کے نام سے اپنے متفرق مضامین دیباچوں اور نظموں کا ایک مجموعہ ۱۲۱۷ھ میں مرتب کیا تھا اس کی تاریخ تدوین "بنا تازہ گلدستۂ حیدری" سے نکلتی ہے۔ یہ گلدستہ بھی زیور طبع سے آراستہ نہ ہو سکا۔ اور صرف قلمی نسخوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے بہ تفصیل ذیل پانچ حصے ہیں۔

(۱) مجموعۂ مراثی۔ حضرت امام حسین علیہ السلام و دیگر شہدائے کربلاؓ کی شہادت پر دردناک مرثیے جو مختلف اوقات میں کہے گئے ہیں۔ ان کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

صلوٰت بھیجتا ہوں میں اب اس امام پر ؎ جس نے کہ سر کٹا دیا امت کے کام پر

(۲) مجموعۂ حکایات۔ اس میں اپنے حالات زندگی۔ اور سو سے زیادہ

لطیفے اور قصے لکھے ہیں۔

(۳) قصۂ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

(۴) قصۂ لیلیٰ مجنوں کا دیباچہ۔

(۵) دیوان غزلیات جس میں غزلوں کے علاوہ قطعے، قصیدے، ہجو اور دیگر متفرق نظمیں شامل ہیں۔

گلدستۂ حیدری کے بعض نسخوں میں ان پانچ حصوں کے علاوہ ایک اور چھٹا حصہ بھی ہے جو اردو شعرا کا تذکرہ ہے لیکن یہ ایک علیحدہ اور مستقل کتاب ہے اس لیے ذیل میں اس کا ذکر علیحدہ عنوان سے کیا جاتا ہے۔

گلشن ہند مرزا علی لطف کا تذکرہ جو اسی نام سے لکھا گیا شایع اور مشہور ہے اس کا تفصیلی بیان ہم نے ان کے حالات میں کیا ہے یہاں اس کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر بدقسمتی سے حیدری کا یہ تذکرہ نہ اب تک شائع ہی ہوا اور نہ کسی نے اس پر روشنی ڈالی ہے یہ اب تک بالکل پردۂ خفا میں رہا۔ حسن اتفاق کہیے یا سوئے اتفاق۔ لطف اور حیدری دونوں نے اپنے تذکرہ کا نام "گلشن ہند" رکھا ہے اور دونوں تذکرے نہ صرف ایک ہی زمانہ بلکہ ایک دو سال کی تقدیم و تاخیر سے تالیف ہوئے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ حیدری نے اپنے اس کارنامہ کو کچھ زیادہ قابل قدر نہیں سمجھا اور اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کے آگے پیش نہیں کیا۔ ورنہ ممکن نہیں کہ ڈاکٹر گل کرسٹ ایسی عمدہ تالیف کی قدر نہ کرتے اور اس کو کالج کی طرف سے شائع نہ کرتے۔

اُردو شاعروں کے متداول اور مشہور تذکروں کی مشکلات و بے ربطی کی وجہ سے انہوں نے لطفؔ جیسے پُر تکلف اور شاعرانہ نثر لکھنے والے سے تذکرہ لکھوایا تو ممکن نہ تھا کہ وہ حیدری کے تذکرہ کی قدر کرتے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ حیدری صاف و شستہ زبان لکھنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے اور خود فورٹ ولیم کالج میں ملازم تھے۔ بہرحال یہی سبب معلوم ہوتا ہے کہ حیدری نے خود اس کی قدر نہ جانی اور اس کی نظر ثانی اور طباعت کا خیال نہ کیا۔

اس تذکرہ کی تقریبِ تالیف حیدری نے یہ بیان کی ہے کہ وہ کشتی میں سوار ہوکر بنارس سے ۱۴ ر رجب ۱۲۱۱ھ کو مرشد آباد آئے اور غالباً وہاں سے کلکتہ کا ارادہ رکھتے تھے کہ راہ میں غازی پور کے قریب اُن کے ایک قدیم دوست مرزا محمد علی دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ دونوں اتفاق سے ایک راہ جارہے تھے۔ مرزائے موصوف شاعری کا بے حد ذوق رکھتے تھے اور سفر میں بھی اُن کے ساتھ کئی ایک شعرائے اُردو کے دیوان موجود تھے، انہوں نے حیدری کو تذکرہ لکھنے کا مشورہ دیا اور اس میں اتنی دلچسپی لی کہ اپنے ساتھ جتنے دیوان تھے اُن کے سپرد کیے اور باصرار تمام ان کو اس کام پر آمادہ کیا۔ اور ان کی تحریک و ترغیب سے یہ تذکرہ تمام ہوا۔ اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۴ھ ہے اور ذیل کے قطعہ سے بھی جو کتاب کے آخر میں درج ہے نکلتی ہے:

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں ۔۔۔ زروئے حقؔ یہ بولے شیخ اور رند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب ۔۔۔ اسے کہتا ہے ہر اک گلشنِ ہند

لوٹ: ۸ + ۱۲۰۶ = ۱۲۱۴۔

لطف نے اپنے تذکرہ میں دیباچہ کے بعد یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلشت ہے
حیران پھرے ہیں بے سرو پا بہمن اور دے — تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہے

"رشکِ بہشت" کے اعداد (۱۲۲۷) میں "جب" کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ حیدری کا تذکرہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے "زینت کلام کی اس آفریدگار کی حمد سے ہے کہ جس نے سخن روح افزا کو ہر ایک بشر کی زبان پر جاری کیا"۔ لطف کا تذکرہ اس طرح شروع ہوا ہے۔ "رعنائی اور زیبائی دلبران سخن کو اس زیست آفریں کی حمد سے حاصل ہے۔ جس نے معشوقان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا" دونوں تذکروں میں حروف تہجی کی ترتیب پر شعرار کا حال بیان ہوا ہے۔ چنانچہ دونوں میں سب سے پہلے شاہ عالم بادشاہ آفتاب تخلص کا ذکر ہے۔ لطف نے اس طرح لکھا ہے "آفتاب تخلص، نور نیر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شہزادگی میں گوہر صدفِ سلطنت کا نام عالی گوہر تھا"، مگر حیدری نے ان الفاظ سے ابتدا کی ہے۔ "مہر سپہر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ عالمگیر ثانی"

آکسفورڈ یونیورسٹی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ میں حیدری کے تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے ڈاکٹر ڈنکن فاربس نے اپنی مرتبہ فہرست میں اس کا ذکر کیا ہے نیز برٹش میوزیم میں ایک نامکمل نسخہ ہے جس کا ذکر مسٹر بلوم ہارٹ ماسوف علیہ سابق پروفیسر ادبیات اردو جامعہ لندن نے فہرست مخطوطات میں

کیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے بعض خانگی کتاب خانوں اور قدیم ذخائر علم و ادب میں بھی اس کا ایک آدھ نسخہ ہو۔ کیا اچھا ہوگا اگر لطف کے گلشن ہند کی طرح حیدری کا تذکرہ بھی دستیاب اور پھر زیور طبع سے آراستہ ہو جائے۔ یہ اُردو تذکروں میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔ ہر دو شخصوں کے نقاط نظر میں جو فرق ہوتا ہے اس کے لحاظ سے ان دونوں معاصر اہل قلم کی ایک ہی موضوع کی دو کتابوں کا مطالعہ جیسا کچھ دلچسپ ہوگا ظاہر ہے ایک طرف لطف کا پر تکلف اور پیچدار طرز بیان اور دوسری طرف حیدری کی صاف و شستہ زبان کا لطف اٹھانے کا اچھا موقع حاصل ہوگا۔ ذیل میں اس کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے شفیق دوست ڈاکٹر زور نے برٹش میوزیم کے نسخہ سے نقل کر کے ارسال کیا ہے جس کے لیے ہم اُن کے بے حد ممنون ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدری کا تذکرہ ان کے حسب دل خواہ مرتب نہ ہو سکا اور جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُن کو اس کی نظر ثانی اور دوبارہ تدوین و ترتیب کا موقع نہیں ملا۔

"افسوس تخلص، نام میر شیر علی اور اُن کے والد بزرگ کا نام مظہر علی خاں ہم جلیس میر حیدر علی خاں حیران بالفعل سند حیات پر موجود ہیں اور شعر اس طرح کہتے ہیں۔

بزم میں اسکی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں — چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں

سودا تخلص نام میرزا محمد رفیع ساکن دلی فخر شعرائے ہندوستان طبع عالی رکھتے تھے یہ اُن سے ہے۔

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی　　نہ ٹوٹا شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ماحوال مولف۔ اس احقر نے موافق اپنی محنت و مشقت کے چھ سات برس میں ان بزرگوں کے نام معہ اشعار و تخلص کے جمع کیے اور کئی جز بخوبی تمام لکھے۔ افسوس ہے کہ وہ جز حرف شین سے لے کر حرف ی خدا جانے کیا ہوئے اس واسطے نوبت تحریر حرف ی تک نہ پہنچی انشاء اللہ تعالیٰ اگر زمانہ اس صورت سے قدرے رفاقت کرتا ہے تو یہ خاکسار پھر نئے سرے احوال ان شعراؤں کا خاطر خواہ لکھتا ہے اور یہ جلد دو چار جز کی جو کلام واہیات سے تیار ہوئی سو دستگیری سے منشی میر بہادر علی صاحب قبلہ دام اقبالہٗ کی کہ وہ دستگیر درماندگاں اور حامی بے کساں ہے اللہ و تعالیٰ دنیا میں خوش و خرم رکھے اُسے اور مشکل کشائی اُس کی مشکل کشا کیا کرے بہ حق محمد و آلہ الامجاد۔"

(تذکرۂ گلشن ہند قلمی برٹش میوزیم)

ہم کو حیدری کی جو مولفات دستیاب ہوئی ہیں اور جن کے نمونے ہم نے اوپر نقل کروائے ہیں ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے حیدری کے طرز بیان کی خصوصیات اور اس کے محاسن و معائب آسانی سے معلوم ہوسکتے ہیں فورٹ ولیم کالج کے اکثر ارباب قلم کی طرح وہ نہایت سادہ و صاف زبان لکھتے ہیں البتہ میر امن کا رجحان روزمرہ اور محاوروں کی طرف ہے وہ محاورہ اور دلی کی مخصوص بولی سے ادھر اُدھر ہٹنا نہیں چاہتے اور ان کے ہاں ہندی الفاظ کا خاصا استعمال ہوا ہے اس کے برخلاف حیدری محاوروں کی طرف متوجہ نہیں ان کا میلان طبع صفائی اور شستگی کی طرف ہے۔ ان کی تحریر میں

عربی فارسی کے الفاظ بکثرت ہیں۔ ابتدائی نثر میں تو جیسا کہ طوطا کہانی کے نمونہ سے ظاہر ہے فارسی ترکیبیں زیادہ ہیں اور ساری کتاب پر فارسیت کا اثر چھایا ہوا ہے مگر بعد میں یہ اکثر کم ہوتا جاتا ہے اور آرائش محفل میں جہاں انھوں نے آزادی کے ساتھ ترجمہ کیا ہے اور اپنی جولانیٔ طبع سے فارسی مضمون کو اردو میں پیرایہ بدل کر پیش کرتے ہیں ان کا قلم سیدھی سادی اور سلیس عبارت لکھنے لگتا ہے۔ میر امن کی باغ و بہار میں جو رنگینی اور بانکپن ہے وہ انہی کی حد تک محدود ہے۔ حیدری کے طرز بیان میں سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں پایا مگر لطف یہ ہے کہ گھلاوٹ سے بھی خالی نہیں رہا ان کے جملے اکثر طویل ہوتے ہیں حرف عطف و کاف صلہ کا کافی التزام ہے۔ قواعد زبان کی پابندی میں جملوں کی ترخیم پسند نہیں کرتے مگر اس کے باوجود بھی کنجلک اور تعقید نہیں۔ اس زمانے میں عام طور پر فارسی کی طرح مضاف پہلے اور مضاف الیہ بعد لایا جاتا تھا یہ محض فارسی سے ترجمہ کرنے کا اثر تھا اور اس عہد کے تقریباً تمام اہل قلم ایسا ہی لکھتے تھے لیکن حیدری کی عبارتوں میں بہت ہی کم جگہ یہ بات نظر آتی ہے۔ ان کی نثر حال کی نثر سے قریب معلوم ہوتی ہے۔

میر شیر علی افسوس

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں میر شیر علی افسوس اپنے ترجمہ گلستاں کی وجہ سے خاص طور پر ممتاز و معروف ہیں۔ افسوس، سید علی مظفر خان کے بیٹے اور سید غلام مصطفیٰ خاں کے پوتے تھے۔ ان کے آبا و اجداد تاف[1] کے رہنے والے اور حضرت امام جعفر صادق رض کی اولاد سے تھے ان کے ایک جد اعلیٰ سید بدر الدین اور ان کے بھائی سید عالم الدین حاجی خافی ابتداً ہندوستان آئے اور آگرہ کے قریب قصبہ نارنول میں توطن اختیار کیا۔ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت (۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء) میں افسوس کے دادا اپنے دونوں بیٹوں سید علی مظفر خاں و سید غلام علی خاں کو لیکر دہلی آئے اور تینوں نے نواب عمدۃ الملک امیر خاں کی ملازمت اختیار کی اسی زمانے میں شیر علی افسوس دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سن ولادت معلوم نہیں مگر ان کی پیدائش ۱۷۳۵ء سے دو تین سال قبل کی ہوگی۔ کیونکہ خود افسوس نے لکھا ہے کہ نواب عمدۃ الملک کی وفات کے تین چار سال بعد جب ان کے والد تلاش معاش میں نکلے تو اس وقت ان کی عمر گیارہ برس کی

[1] باغ اردو کے ایک قدیم قلمی اور ایک مطبوعہ نسخہ میں تاف کو خاف لکھا ہے ۱۲

کی تھی۔ عمدۃ الملک نے ۱۷۴۶ء میں انتقال کیا اس لحاظ افسوس کی ولادت ۱۷۳۵ء سے قبل کی ہونی چاہیئے۔

افسوس کے والد اور چچا دونوں ایک عرصہ تک عمدۃ الملک کے ساتھ رہے خصوصاً سید علی خاں اپنی کارکردگی و معاملہ فہمی کی بدولت بہت جلد صاحب اقتدار ہوگئے اور جب ۱۷۴۶ء میں عمدۃ الملک نے وفات پائی تو وہی منصرمانہ طور پر صوبہ الہ آباد کے نائب بنائے گئے۔ ادھر محمد شاہ کی کی سلطنت درہم برہم ہوی اور عمدۃ الملک نے بھی وفات پائی اور ادھر چند روز بعد غلام علی خاں بھی راہی ملک عدم ہوئے نہ اگلا سا زمانہ رہا نہ پہلے سے مربی۔ علی مظفر خاں ترک ملازمت کر کے چند سال خانہ نشیں رہے اس کے بعد قاسم علی خاں نواب بنگالہ کے پایہ تخت پٹنہ کا رخ کیا اور یہاں پہنچکر اس کے ہاں ملازم اور توپ خانہ کے داروغہ مقرر ہوئے۔ میر قاسم علی خاں کے انتقال کے بعد اس کے جانشین جعفر علی خاں کی ماتحتی میں اس خدمت کے علاوہ اور بھی کسی عہدہ پر فائز ہوئے اور ۱۷۶۰ء میں اس کے معزول ہونے تک اسی کے متوسل رہے جس وقت افسوس کے والد نے پٹنہ کا رخ کیا افسوس کی عمر دس گیارہ برس کی تھی اور گلستاں پڑھتے تھے وہ خود لکھتے ہیں "سیر دیوان دلی کی اکثر کرتا طبیعت موزوں ان ایام میں بھی تھی۔ چنانچہ کئی شعر اوقاتِ مذکورہ میں بہ وضع تمام کہے تھے۔ یہ مطلع انہی میں سے ہے۔ بیت

ارے پیارے ترے اس حسن رنگیں کا خدا حافظ　　تری اس زلف پر پیچ کا محمد مصطفیٰ حافظ"

علی مظفر خاں بجعفر علی خاں حاکم بنگالہ کی معزولی کے بعد پٹنہ سے نکل کر نواب خانِ عالم بقا اللہ خاں کی وساطت سے نواب شجاع الدولہ والیِ اودھ (۱۷۶۵ء تا ۱۷۷۵ء) کی سرکار میں تین سو روپیہ کے ملازم ہوئے لیکن تین چار سال لکھنؤ میں رہنے کے بعد جب وہ ملازمت کچھ دیرپا نظر نہ آئی تو دکن میں کا رخ کیا اور حیدرآباد پہنچے کئی سال حیدرآباد میں رہ کر وہیں انتقال کیا۔

افسوس اپنے والد کے لکھنؤ آنے سے دو سال قبل ہی لکھنؤ میں نواب شجاع الدولہ کے بھتیجے نواب سالار جنگ کے ہاں ملازم ہو چکے تھے اور ان کے بیٹے میر نوازش علی خاں المخاطب بہ سرفراز جنگ کی آتالیقی کی خدمت انکے سپرد تھی۔ افسوس نے اپنا دیوان سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا سالار جنگ کی وفات کے بعد سرفراز جنگ نے بھی اپنے حوصلہ کے موافق ان کی قدردانی کی۔ ان دنوں مرزا جوان بخت جہاندار شاہ ولیعہد سلطنت مغلیہ لکھنؤ میں رونق افروز تھے انھوں نے جب افسوس کا کلام سنا تو ازراہ قدردانی طلب کر کے اپنے مصاحبوں میں شریک کر لیا۔ افسوس نے اس فراغت و بےفکری کے زمانہ میں عربی کی تحصیل کی اور کتب متداولہ پر کافی عبور حاصل کر لیا۔

لکھنؤ اس زمانہ میں شعرا، علما و فضلا کا مرجع و مرکز بنا ہوا تھا میر تقی میر۔ مرزا رفیع سودا جرأت اور انشا وغیرہ شعرا کی صحبتوں میں افسوس کے ذوق شعرگوئی کو خوب ترقی ہوئی۔ اکثر ان اساتذہ کے مشاعروں میں غزلیں

پڑھتے اور تحسین و آفریں کا صلہ حاصل کرتے تھے۔ مرزا جواں بخت کو بھی
افسوس کا کلام بہت پسند آیا اور انھوں نے ان کو اپنی بزم کا شاعر بنا لیا۔
افسوس کا یہ زمانہ نہایت فراغت اور لطف کے ساتھ گزرا۔ جب شہزادہ
جواں بخت نے دلی کا ارادہ کیا تو افسوس کو بھی لیجانا چاہا مگر افسوس نے
لکھنؤ کی پرلطف صحبتیں چھوڑ کر اجڑی ہوئی دلی جانا پسند نہ کیا۔ اور معذرت
کرکے شہزادہ جواں بخت کے بعد یہیں رہے۔ نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء)
کے نائب حسن رضا خاں المخاطب بہ سرفراز الدولہ نے افسوس کی سرپرستی
کی اور اپنی مصاحبت و ہمراہی میں رکھ کر فکر معاش سے مستغنی کر دیا۔ یہ
سرفراز الدولہ وہی ہیں جن کی مرزا رفیع سودا نے مدح سرائی کی ہے کلیات سودا میں
دو قصیدے ان کی مدح میں موجود ہیں جن کے مطلعے حسب ذیل ہیں

صباح عید ہے اور یہ سخن ہے شہرۂ عام — حلال دختر رز بے نکاح و روزہ حرام
عزیز عقل کو سودا کی تھی جدائی شاق — سو اس کنے وہ پھر آیا ہے بس کہ تھا مشتاق

افسوس نے ان دنوں شاعری کا مشغلہ قریب قریب ترک کر دیا تھا اور
ان کا شغل درس و تدریس تھا۔

انہی ایام میں انگریز حکام کو فورٹ ولیم کالج کے لئے لائق منشیوں کی
ضرورت داعی ہوئی اور وہ ان کی تلاش و انتخاب کرنے لگے۔ اس سلسلہ
میں میر تقی میر سے ملازمت کی خواہش کی گئی مگر خود دار سرتاج شعرائے اردو
نے انکار کر دیا۔ اس موقع پر حسن رضا خاں نے اکتوبر ۱۸۰۰ء میں کرنل اسکاٹ
سے افسوس کا تعارف کرایا اور ان کی فضیلت علمی اور کلام کی بے حد تعریف

کی۔ کرنل اسکاٹ کلام سن کر بے حد محظوظ ہوئے اور فی الفور ان کا انتخاب کر کے کلکتہ بھیج دیا افسوس نے جیسا کہ خود ان کے بیان سے ظاہر ہے قدیم زمانہ کی شاعری سے اکتا کر فکر سخن ترک کر دی تھی اور درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے تھے نیز لکھنؤ کے معاشرتی و اقتصادی حالات نے لکھنؤ سے ان کی دل بستگی اٹھا دی اس لئے "صاحبان عالیشان" کی نوکری کو غنیمت سمجھا اور سیدھے کلکتہ کی راہ لی کلکتہ میں ڈاکٹر گل کرسٹ نے ان کی قابلیت کا اعتراف کر کے دو سو روپیہ ماہوار مشاہرہ پر تصنیف و تالیف کے لئے ان کا تقرر کیا افسوس نے کلکتہ میں کوئی آٹھ نو سال تصنیف و تالیف کا کام کر کے ۱۸۰۹ء میں وفات پائی بیل[1] نے اپنی کتاب میں افسوس کا سنہ وفات ۱۸۰۶ء بتایا ہے گارسان دتاسی اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ۱۸۰۹ء لکھا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے۔

مرزا علی لطف مولف تذکرہ گلشن ہند افسوس کے نہ صرف معاصر بلکہ قدیمی دوست تھے انھوں نے اپنے تذکرہ میں ان کا کسی قدر تفصیلی حال لکھا ہے مگر تاریخ ولادت ان کے ہاں بھی نہیں۔ افسوس نے لکھنؤ سے نکل کر پہلے مرشد آباد میں مرزا علی لطف کے ہاں چند روز قیام کیا اور ان سے بھی کلکتہ آنے کا وعدہ لیا۔ اغلب ہے کہ مرزا علی لطف انہی کے ایما سے کلکتہ آئے اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی نگرانی میں اپنا تذکرہ مرتب کیا لطف نے افسوس کے حالات بیان کرنے کے بعد ان کی خوش اخلاقی اور علمی فضائل

---

[1] بیوگرافیکل ڈکشنری اڈیل طبع دوم

کے متعلق اپنی حسب ذیل رائے لکھتے ہیں "فی الحقیقت کہ ذات انکی زمانہ کے انتخاب سے ہے۔ عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکسار میں فرد کامل ہیں منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں کلیات و معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی ماہر ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں اقسام نظم میں۔"

قیام کلکتہ کے زمانہ میں افسوس نے دو کتابیں مرتب کی ہیں ایک "باغ اردو" اور دوسری "آرائش محفل" اس کے علاوہ تصحیح اور نظر ثانی کا بہت سا کام انجام دیا ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی اب ہم بہ لحاظ تاریخ ان کی تالیفات کا ترتیب وار ذکر کرتے ہیں۔

دیوان

افسوس نے اپنا دیوان لکھنؤ میں سالار جنگ کی سرپرستی میں ترتیب دیا تھا اس لحاظ سے وہ ان کا پہلا کارنامہ ہے۔

نساخ نے لکھا ہے کہ شاعری میں افسوس کو میر حیدر علی حیران اور میر سوز سے تلمذ حاصل تھا صاحب تذکرہ گلشن ہند جو افسوس کے معاصر اور دوست تھے ان کے تلمذ کے متعلق لکھتے ہیں "اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا۔ اور علی ابراہیم خان مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے اس کی سند اپنی تفتیش نہیں پہنچی اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی" مصحفی نے بھی اپنے تذکرہ ہندی میں ان کو حیران اور میر سوز کا شاگرد بتایا ہے۔ افسوس کا دیوان جملہ اصناف سخن پر مشتمل ہے۔ عام دواوین کی طرح حروف تہجی پر ترتیب دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے قصائد

کا مجموعہ ہے ان میں سے اکثر قصیدے آنحضرت صلعم کی تعریف میں ہیں باقی نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء) اور مارکوئس ویلزلی گورنر جنرل ہند (۱۷۹۸ء تا ۱۸۰۵ء) کی مدح میں ہیں اس کے بعد چند سلام اور مرثیے ہیں۔ دیوان کا دوسرا حصہ غزلیات کا ہے جس میں حروف تہجی کی ترتیب پر غزلیں ہیں غزلیات کے بعد مخمسات، رباعیات ایک ترکیب بند اور ایک واسوخت ہے اور آخر میں گیارہ قطعات کا مجموعہ ہے جس میں سے پہلے تین قطعے شہزادۂ جوان بخت مرزا جہاندار شاہ کی شادی سفر شکار اور تہنیت عید کے متعلق ہیں۔ باقی آٹھ قطعوں میں مارکوئس ویلزلی اور فورٹ ولیم کالج کے بعض پروفیسروں کی مدح ہے۔ ٹھیک طور پر نہیں بتایا جا سکتا کہ افسوس کا دیوان کن مطابع سے شائع ہوا ہے۔

برٹش میوزیم میں "دیوان افسوس" کا ایک بہت ہی قدیم قلمی نسخہ ہے جو ہر طرح مکمل اور صحیح معلوم ہوتا ہے اس میں جملہ اصناف کا کلام مذکورۂ بالا ترتیب پر دیا ہوا ہے اور قصائد سے پہلے فارسی میں بطور مقدمہ افسوس کے حالات بھی لکھے ہیں۔ حالات تقریباً وہی ہیں جو خود افسوس نے اپنی "باغ اردو" میں لکھے ہیں یہ مقدمہ میر حیدر بلگرامی کا لکھا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ آرائش محفل کی تالیف سنہ ۱۲۲۰ھ مطابق ۱۸۰۵ء سے قبل کا ہے کیونکہ اس میں افسوس کی اس تالیف کا مطلق ذکر نہیں کیا گیا۔

کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں بھی ایک قلمی نسخہ ہے اس کا خط شکستہ آمیز نستعلیق ہے اور کسی قدر نامکمل معلوم ہوتا ہے۔

علامہ سید حسین بلگرامی عماد الملک بہادر نے ۱۹۰۳ء میں "منتخب اشعار" کے نام سے انتخاب شعرائے اردو کا ایک سلسلہ مدراس یونیورسٹی کے لئے ترتیب دیا تھا اس سلسلہ میں میر تقی، سودا، میر سوز، قایم چاندپوری کے ساتھ افسوس کا کلام بھی شائع ہوا ہے یہ انتخاب بہت مقبول ہوا اور ایک سے زیادہ مرتبہ اسکے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ حکیم محمد علی عرشی نے اس کا ایک شرح ایڈیشن بھی مطبع قاسمی حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔ افسوس کی عاشقانہ شاعری قدیم اساتذہ کے ڈھنگ کی ہے وہی خیالات اور وہی انداز بیان ہے۔ بعض بعض جگہ قدیم الفاظ جیسے ٹک بہ معنی ذرا، ٹلک، نت، بے چیز معنے بے سبب وغیرہ بھی ہیں۔ ذیل میں ایک غزل درج کی جاتی ہے۔

نہ ساقی ہے نہ مینا ہے نہ بزم یار جانی ہے
حقیقت میں نہیں جیتے بصورت زندگانی ہے

ہوا کو جھکے یہ جو نہی جلوہ گر وہ برق وش نہی
کہا اک خلق نے دیکھو یہ آفت ناگہانی ہے

نوازش پر مزاج آیا جہاں دی گالیاں مجھ کو
کرم ہے آپ کا طرفہ عجائب مہربانی ہے

مرا زخم جگر جراح سے سلوائیں کیوں ہمدم
کسی شمشیر زن کے ہاتھ کی یہ تو نشانی ہے

سنو ٹک گوش دل سے قصۂ جانسوز کو میرے
کہ جگ بیتی نہیں ہے آپ بیتی یہ کہانی ہے

عبث ہے سوچ تجھ کو نامہ بر دے شوق سے مجھ کو
کوئی جھڑکی کوئی گالی اگر اسکی زبانی ہے

تو اپنے ہاتھ کا چھلا جو ہر اک سے چھپاتا ہے
بتا افسوس کس پردہ نشیں کی یہ نشانی ہے

نالوں میں کبھی نہ دیکھی تاثیر ۔۔۔۔ آہوں میں کبھی اثر نہ دیکھا
عرصۂ عمر بہت کم ہے دلا گل کی طرح ۔۔۔۔ چمن دہر میں دن کاٹ تو ہنس کر اپنا
جی ہو گئے یہ تنگ سخت گھبرایا ہے ۔۔۔۔ رکنا مرا ناک میں دم آیا ہے
روتا ہوں تری گلی میں دل کھو کر ۔۔۔۔ کیا ہنستا ہے کچھ تو نے پڑا پایا ہے

مصطفےٰ خاں شیفتہ نے اپنے تذکرہ "گلشن بے خار" میں یہ اشعار انتخاب کئے ہیں ۔

قفس سے چھوٹنے کی امید ہی نہیں افسوس ۔۔۔۔ حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا
کیا لکھوں اس کو میں احوال یہ کہنا قاصد ۔۔۔۔ بے حواسی کے سبب طاقت تحریر نہیں
دیکھتے ہی اُسے حاضر ہوئے مر جانے کو ۔۔۔۔ وہی اشخاص جو یاں آئے تھے سمجھانے کو
کیوں نہ ہو اس قدر گھمنڈ اس بت پر غرور کو ۔۔۔۔ صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
اس کے اٹھتے ہی جی پہ آن بنی ۔۔۔۔ دیکھئے آگے آگے کیا ہوئے
صورت تجھے حق نے دی پری سی ۔۔۔۔ پر آہ پیت نہ دی ذری سی
کچھ بات تم سے کر نہیں سکتے ہیں ہزار حیف ۔۔۔۔ مدت میں تم ملے بھی تو غیروں کے گھر ملے

باغ اردو

یہ افسوس کا شاہکار اور نہایت مقبول و معروف کارنامہ ہے اور سچ پوچھو تو آج ان کا نام اسی سے زندہ ہے یہ حضرت شیخ سعدی (م ۱۲۹۱ء) کی مقبول عالم کتاب گلستان کا اردو ترجمہ ہے اس کے ترجمہ کرنے کی تقریب خود افسوس نے اس طرح بیان کی ہے "ایک دن صاحب موصوف (ڈاکٹر گل کرسٹ) نے مہربانی سے فرمایا کہ گلستان سعدی شیرازی کا زبان اردو میں ترجمہ کر۔ میں نے دھیان کیا کہ عبارت اسکی بظاہر صاف

و بہ باطن پیچدار ہے۔ علاوہ اس کے عبارت کا اختلاف بے شمار ہے اور رتبہ اپنی قوت تالیف کا اور شیخ مرحوم کی تصنیف کا جو خیال کیا تو کسی طرح کی نسبت نہ پائی ع ۔ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔ ارادہ کیا اس سے پہلو تہی اور سر عجز آگے دھروں۔ پھر سوچ آیا کہ مبادا حاشیہ خیال میں ان کے گزرے کہ اس نے ہمارا کہنا نہ مانا اور اس بات کو سہل جانا تب قصد کیا کہ ایک حکایت طولانی کہ نظم و نثر اس میں کثرت سے ہو اسے ترجمہ کروں اگر بخوبی سر انجام ہوی اور اہل معنی کو پسند پڑی فبہا والا صاحب ممدوح سے اس امر کی معافی چاہوں گا۔ چنانچہ قاضی ہمدان کی حکایت کا ترجمہ کیا اور وہ علماء و عقلا و شعرا کہ یہاں تھے ان کو پسند پڑا تب اس ضعیف نے کمر ہمت بقوت باندھی اور سعی بلیغ کی۔"

"باغ اردو" کی تاریخ تالیف میں اختلاف ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے لکھا ہے کہ یہ ۱۸۰۰ء میں تالیف ہوی نیز مولف سیر المصنفین نے بھی یہی سنہ لکھا ہے مگر خود افسوس نے اس کے دیباچہ میں ایک قطعہ تاریخ دیا ہے جس سے آغاز تالیف کا سنہ نکلتا ہے۔

میں تاریخ اس کی جو چاہا مع نام   کہوں دلچسپ یہ آئین یکو
کہا اس میں ہاتف غیبی یہ بولا   کہ آغاز اردو ہے باغ اردو

"باغ اردو" کے اعداد (۱۲۱۴) میں آغاز اردو یعنے الف کے عدد کا تدخلہ کیا جائے تو اس سے ۱۲۱۵ھ برآمد ہوتا ہے اور یہی اس کی تالیف کی تاریخ ہے۔ باغ اردو کی پہلی اشاعت خود افسوس کے اہتمام ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء میں

ہوی تھی۔ پھر خود افسوس نے خاتمۃ الکتاب میں صاف طور پر لکھ دیا ہے
کہ "سن ہجری بارہ سے سولہ اور عیسوی اٹھارہ سے دو میں ترجمہ کہ مسمی
بہ باغ اردو ہے تمام ہوا" اس کے بعد یہ قطعۂ تاریخ دیا ہے۔

عون توفیق ربّ سبحاں سے ترجمہ یہ کیا تمام میں نے جب
ختم کی اس کے پھر عقل سے کی میں نے تاریخ عیسوی جو طلب
ابتدا کے ہزار سے یہ کہہ باغ اردو ہوی گلستاں اب

نیز اس وقت ہمارے پیش نظر جو نسخہ کلکتہ کا مطبوعہ ۱۲۵۱ سنہ ہجری
ہے اسمیں ناشر نے لکھا ہے کہ ابتداءً یہ ترجمہ خود افسوس نے ۱۲۱۷ھ م ۱۸۰۲ء سنہ
میں طبع کرایا تھا۔ ان شواہد کی موجودگی میں اس کی تاریخ تالیف ۱۸۰۸ء سنہ
کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔

افسوس کی یہ گراں قدر کتاب آج کل بالکل کمیاب ہے۔ سیر المصنفین کے
مولف کو باوجود تلاش و سعی بلیغ کے ایک نسخہ بھی حاصل نہ ہو سکا انکا بیان ہے کہ
خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے کتب خانہ میں انھوں نے ایک قلمی نسخہ دیکھا تھا۔
ہمارے پیش نظر اس وقت جو نسخہ ہے وہ کلکتہ میں ۱۲۵۱ھ سنہ میں طبع ہوا
اور کلکتہ کی قدیم مطبوعات کی طرح ٹائپ کے حروف پر ہے یہ نسخہ بالکل مکمل
اور اچھی حالت میں ہے۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک نسخہ اسی سنہ
اور مطبع کا مطبوعہ محفوظ ہے مگر اس میں دیباچہ کے چار صفحوں کا حاشیہ
کسی قدر کرم خوردہ ہے۔

لہ (ب) کے دو شامل کرنے کے بعد ہی اچھے مصرع سے سنہ ۱۸۰۲ء برآمد ہوتے ہیں ۱۲

باغ اردو کی ترتیب مضامین حسب ذیل ہے :۔

۱۔ ماحوالِ رسم خط۔ اس عنوان سے افسوس نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے رسالہ رسم الخط و اعراب کا خلاصہ لکھا ہے۔

۲ پہلا دیباچہ و تعریف میں لارڈ صاحب کی اور احوال مترجم کا اور بعضے عذروں میں کتاب کے "اس میں افسوس نے اپنے مربی لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند کی مدح کی ہے اور سرسری طور پر اپنے حالات لکھ کر ترجمہ کی مشکلات کا ذکر اور صاحبانِ فہم کے سامنے اپنی بے بضاعتی کا عذر کیا ہے۔

۳۔ ترجمہ دیباچہ شیخ سعدی ؒ

۴۔ ترجمہ متن گلستاں مشتمل بر ہشت ابواب

۵۔ ترجمہ خاتمہ اصل کتاب

۶۔ خاتمہ باغ اردو کا۔

۷۔ "چند سطور بعضے عذروں میں اور فائدوں میں" اس حصہ میں اپنے ترجمہ کے طریقہ پر بحث کی ہے۔

۸۔ "چند سطریں شیخ مرحوم کے احوال میں" اس میں شیخ سعدیؒ کے حالات اور ان کے بعد امیر خسروؒ کا ذکر خیر اور شعراء کی قدر دانی کا بیان اور السن علی دین ملا کہم کی تشریح کی ہے۔

۹۔ فائدہ۔ اس میں اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا کام کرنے کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے ان پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مولف و

مصنف کے لئے بھاکا، فارسی، عربی، اور قدرے سنسکرت اور ترکی جاننا ضروری ہے۔ نیز بلاغت اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ پر زور دیا ہے اردو زبان میں گلستان کے ایک دو ترجمے اور بھی ہوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر نہ ہونے کی وجہ سے ہم ٹھیک طور پر موازنہ کر کے نہیں کہہ سکتے کہ افسوس کا ترجمہ بہترین ہے یا نہیں لیکن صرف ان کے ترجمہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ افسوس نے گلستاں کا نہایت عمدہ اور بے نظیر ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ زبان سلیس و صاف ہو اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں اور ان کا ترجمہ ان کے اپنے زمانہ کی اردو کا نہایت اچھا نمونہ ہے۔ گلستاں میں جا بجا برمحل اشعار بکثرت ہیں ان اشعار کا اگر نثر میں ترجمہ کیا جائے تو ان کی اصلی خوبی بالکل غائب ہو جاتی ہے اور شیخ سعدی رح کے بعض مصرعے اور شعر ایسے فصیح و بلیغ ہیں اور کہاوت بنکر زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں کہ وہ کسی طرح ترجمہ کے متحمل ہی نہیں۔ افسوس نے ایسے مصرعوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر ان کے حسن و خوبی کو خراب نہیں کیا بلکہ انھیں بجنسہٖ کا توں نقل کر لیا ہے۔ افسوس کے طرز بیان میں میر امن کے بیان کا سا لوچ اور بے ساختہ پن نہیں۔ میر امن کی زبان بالکل محاورہ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے وہ جو بات کہتے ہیں روز مرّہ اور محاورہ سے خالی نہیں ہوتی اس کے برخلاف افسوس کی زبان میں سلاست و صفائی کے ساتھ سنجیدگی و وقار پایا جاتا ہے وہ عربی فارسی کے فقرے بکثرت استعمال کرتے ہیں اور

اس مصوص میں سید حیدر بخش حیدری سے بھی بڑھے ہوئے ہیں مثال کے طور پر ان کے ترجمے کے بعض نمونے ملاحظہ ہوں :۔

گلستان

حکایت یکے از دوستاں را گفتم کہ امتناع سخن گفتنم بہ علت ان اختیار آمدہ است کہ غالب اوقات در سخن نیک و بد اتفاق رفت و دیدۂ دشمناں جز بر بدی نمی آید گفت دشمن ان بہ کہ نیکی نہ بیند۔

شعر ؎ ہنر بہ چشم عداوت بزرگتر عیبے است
گل است سعدی و در نظر دشمناں خار است

بیت ؎ نور گیتی فروز چشمۂ ہور
زشت باشد بہ چشم موشک کور

حکایت یکے از بزرگاں پارسائے را گفت کہ چہ گوئی در حق فلاں عابد کہ دیگراں در حق او بہ طعنہ سخنہا گفتہ اند۔ گفت بر ظاہرش عیب نمی بینم و در باطنش عیب نمی دانم۔

پس بر وے طعنہ چگونہ کنم ؎
ہر کسے را کہ پارسا بینی
پارسا دان و نیک مرد انگار

باغ اردو

حکایت۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ چپ رہنا میں نے اس سبب سے اختیار کیا ہے کہ بولنے میں اکثر اوقات نیک و بد کا اتفاق ہو جاتا ہے اور آنکھ دشمن کی سوا بدی کے کچھ نہیں دیکھتی بولا وہ کہ اے برادر دشمن وہی بہتر ہے کہ نیکی نہ دیکھے۔

شعر ؎ ہے بڑا عیب ہنر دشمن کی آنکھوں میں
پھول ہے سعدی پہ دیکھیں دشمن کی نگاہ

بیت ؎ گو جہاں روشن ہے سورج سے
پر چھچھوندر کی نظروں میں ہے برا

حکایت۔ ایک بزرگ نے کسی پرہیزگار سے پوچھا کہ فلانے عابد کے حق میں آپ کیا کہتے ہیں کہ اکثر اشخاص اس کے حق میں طعنہ آمیز باتیں کہتے ہیں کہا اس نے کہ بظاہر اس میں کچھ عیب نہیں دیکھتا اور باطن سے آگاہ اللہ ہے

جس کو ظاہر میں متقی دیکھے
اسکے تقوی کا تو نہ کر انکار

ورنہ دانی اے درنہانش چیست مختسب را درون خانہ چہ کار

حکایت درویشے راشنیدم کہ در آتش فاقہ می سوخت و خرقہ بہ خرقہ می دوخت و تسکین خاطر خود را می گفت

بنان خشک قناعت کنیم و جامۂ دلق
رنج محنت خود بہ کہ بار منت خلق

کسے گفتش چہ نشینی کہ فلاں دریں شہر طبع کریم دارد و کرم عمیم میان بخدمت آزادگان بستہ بر در دلہا نشستہ۔ اگر بر صورت حال چنان کہ ہست وقوف یابد۔ پاس خاطر عزیزاں داشتن منت دارد و غنیمت شمارد۔ گفت خاموش کہ در پستی مردن بہ کہ حاجت پیش کسے بردن۔ قطعہ

ہم رقعہ دوختن بہ والزام کنج صبر
کز بہر جامہ رقعہ برخواجگان نبشت
حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

کھوج مت کر کسی باطن کی تو محتسب را درون خانہ چہ کار

حکایت۔ ایک فقیر کو میں نے سنا کہ بھوکا فاقہ کی آگ میں جلتا پیوند پر پیوند لگا بیٹھا اور تسلی اپنی خاطر کی ان دو شعروں سے کرتا ہے

لباس فقر و نان خشک پر بیٹھ رہ لا زم ہے کر بیٹھو قناعت
ہر اک کی منتوں کا بوجھ اٹھانا ہے ہر اک کی منت

کسی نے کہا اس سے کیا بیٹھا ہے تو۔ فلانا شخص اس شہر میں ایسا صاحب ہمت ہے کہ دست کرم اپنا اس نے کھول دیا ہے اور اپنی کمر کو آزادوں کی خدمت کے لئے باندھ لیا ہے۔ اگر صورت حال پر تیری اطلاع پاوے تو اپنے پر منت رکھے اور تیری خدمت کرنی غنیمت جانے۔ کہا اس نے چپ رہ کہ فقیری میں مرنا اچھا ہے کہ حاجت کسی کے آگے لیجانا۔ چنانچہ کہہ گئے ہیں

پیوند کا ٹکڑہ صبر کا کونا کر اختیار
پیدا نہ کیا ہے کوئی جامہ کی التجا
مثل عذاب نار ہے ہمسایہ کے سبب
جانا ترا جو گلشن فردوس میں ہوا

گلستان سعدی کے ترجمہ سے فارغ ہو کر ۱۸۰۳ء میں افسوس نے بجائے کسی اور تالیف یا ترجمہ کے دوسری کتابوں کی تصحیح و نظر ثانی کا کام انجام دیا۔

اور آخر ۱۸۰۶ء تک اسی میں مشغول رہے سب سے پہلے میر بہادر علی حسینی کی کتاب "نثر بے نظیر" کی نظر ثانی کی۔ پھر نہال چند لاہوری کی کتاب "مذہب عشق" کی تصحیح کی۔ یہ دونوں بھی فورٹ ولیم کالج کے منشی اور مشہور اہل قلم ہیں ان کا تفصیلی حال آگے علیحدہ عنوانات سے لکھا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج کے لئے علاوہ نثر کی کتابوں کے نظم کی کتابیں بھی مطلوب تھیں ان کا اردو میں کافی ذخیرہ موجود تھا صرف نظر ثانی اور سلیقے کے ساتھ انتخاب کی ضرورت تھی چنانچہ مرزا رفیع سودا کا دیوان داخلی و خارجی دونوں قسم کی اعلیٰ شاعری کا عمدہ مجموعہ ہونے کی وجہ سے نظر اول میں چن لیا گیا اور اس کی تصحیح و انتخاب کا کام افسوس اور چند دیگر اہل قلم کے سپرد کیا گیا۔ افسوس اور ان کے ساتھیوں وغیرہ نے اپنے حسن مذاق سے کلیات سودا کا ایک ایسا انتخاب مرتب کیا جس میں ہر صنف سخن کا بہترین نمونہ موجود ہے اس کے نسخے بھی کمیاب ہیں کتب خانہ آصفیہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ایک ایک نسخہ موجود ہے۔ ہمارے پاس بھی ایک نسخہ ہے یہ ۱۸۱۰ء کا مطبوعہ ہے اور اس میں سودا کے چند چیدہ قصائد غزلیات کا بہترین انتخاب اور مثنوی، مرثیہ اور قطعات کے عمدہ نمونے صحت کے ساتھ مندرج ہیں۔

آرائش محفل

افسوس کا ایک اور یادگار کارنامہ "آرائش محفل" ہے یہ ہندوستان کی ایک معتبر و مستند فارسی تاریخ موسومہ "خلاصۃ التواریخ" کا اردو ترجمہ ہے "خلاصۃ التواریخ" کے مصنف منشی سجان رائے

پٹیالہ کے باشندے تھے اور انھوں نے ۱۱۸۰ھ میں یہ کتاب بڑی محنت اور کاوش سے تیار کی تھی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی جمیع عمدہ تواریخ کا خلاصہ ہے انھوں نے اپنے جو ماخذ بتائے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں :-

عہد ہنود (۱) مہابھارت، راماین اور ہری ونسہ کے فارسی ترجمے جو شہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئے تھے (۲) بھگوت گیتا، یوگا اور بسیشٹا جو شیخ احمد اور دیگر علما نے دارا شکوہ کے لئے فارسی میں ترجمے کئے تھے (۳) گل افشاں یعنے سنگاسن بتیسی کا فارسی ترجمہ (۴) پدماوت یعنے رتن سین مہارانا چیتور کی کی تاریخ وغیرہ

عہد اسلام (۱) تاریخ محمود غزنوی از مولانا عنصری (۲) تاریخ سلطان شہاب الدین غوری (۳) تاریخ علاء الدین خلجی (۴) تاریخ فیروز شاہی از مولانا عزیز الدین خالد خانی (۵) تاریخ افاغنہ از حسین خان افغانی (۶) ظفرنامہ از شرف الدین یزدی (۷) تیمور نامہ ہاتفی (۸) تواریخ بابری (۹) اکبر نامہ ابوالفضل (۱۰) طبقات ناصری (۱۱) جہانگیر نامہ (۱۲) تاریخ شاہجہاں از وزارت خان (۱۳) تاریخ عالمگیر از میر محمد کاظم وغیرہ۔

چونکہ مصنف کے پیش نظر بادشاہ اور راجہ کے متعلق اس کے معاصرین کی تاریخیں تھیں اس لئے اس نے ان سے استفادہ کرکے نہایت معتبر و صحیح تاریخ مرتب کی ہے۔ افسوس کہ مسٹر جے ہیچ ہارنگٹن کے ایما سے ۱۲۱۹ھ میں اس کا اردو میں ترجمہ کرنا شروع کیا اور عہد ہنود کا پورا حصہ ۱۲۲۰ھم ۱۸۰۵ء میں ختم کرکے "آرائش محفل" اس کا نام رکھا۔ "آرائش محفل" پہلی مرتبہ ۱۸۰۸ء میں

کلکتہ سے شائع ہوئی اور چند سال بعد ہی اردو دانی کے اعلیٰ امتحانات میں داخل نصاب ہو گئی۔ اس ضرورت کے سلسلے میں سنہ ۱۸۴۲ء اور سنہ ۱۸۶۳ء میں کلکتہ سے اس کے دوسرے ایڈیشن نکلے۔ اس بعد لکھنؤ اور لاہور کے مطابع سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔

جان شیکسپیر نے اس کے دس ابواب کا انگریزی ترجمہ بھی اپنی "منتخبات ہندی" مطبوعہ ڈبلن سنہ ۱۸۴۶ء میں شائع کیا ہے اس کے علاوہ میجر ہنری کورٹ نے پوری کتاب کو انگریزی میں منتقل کر کے سنہ ۱۸۷۱ء میں الہ آباد اور سنہ ۱۸۸۲ء میں کلکتہ سے دو ایڈیشن شائع کئے۔ آرائش محفل میں ہندوستان اور اس کے مختلف صوبجات کا مفصل بیان وہاں کی پیداوار وغیرہ کے حالات کے ساتھ دیا ہے اس کے بعد زمانہ قدیم سے لیکر فتوحات اسلامیہ تک کی جامع اور وسیع تاریخ بیان کی ہے اس کتاب کا طرز بیان مضمون کتاب کی نوعیت کا لحاظ کرتے بالکل سلیس اور صاف ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیت بھی پائی جاتی ہے گو اس میں اس زمانہ کی عام کتابوں کی طرح مبالغہ آرائیاں نہیں ہیں تاہم بعض موقعوں پر ان کا قلم بے راہ ہو جاتا ہے اور تعریف میں دو چار فقرے زیادہ نکل جاتے ہیں ذیل میں پہلے باب کا اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے طرز بیان کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

مملکت ہندوستان کی تاریخ

وہ جب سے یہ مرکز خاکی آرام گاہ حیوانات ہوا ہیکڑوں لاکھوں شہر قصبے بسے اور بستے جاتے ہیں۔ کوئی اونے کوئی اعلےٰ لیکن ہندوستان کی سرزمین

کا عالم سب سے نرالا ہے۔ کوئی ولایت اسکی وسعت کو نہیں پہنچتی اور کسی مملکت کی آبادی اس کو نہیں لگتی۔ یہاں کی ہر ایک بستی ہیں گھما گھمی جا بجا ایک نئی طرح کا عالم۔ ہر شہر و قصبہ میں ستھری پاکیزہ پختہ متعدد سرائیں مسافر کے واسطے ہر موسم کے اوڑھنے بچھونے اور اقسام کی غذائیں اکثر بیسیوں مسجدیں خانقاہیں مدرسے۔ باغات۔ غریبوں بے کسوں مسافروں کے لیے متعدد مکانات۔ قلعے بڑے بڑے مضبوط وسعت میں ایسے کہ سیکڑوں گاؤں ان میں بس جائیں اور رفعت میں اس قدر کہ بادل ان کے نیچے رہیں۔ ندی نالے تالاب کوئیں لطیف و پاکیزہ ہزار ہا۔ پانی ان میں میٹھا ٹھنڈا ستھرا بھرا ہوا۔ بڑے بڑے دریاؤں میں کشتیاں نواڑے بجرے وغیرہ بے شمار۔ شاہ راہ کے ندی نالوں پر بیشتر مقاموں پر پل بندھے ہوے تیار۔ اکثر راستوں میں کوسوں تک سایہ دار درختوں کی دو طرفہ قطار۔ ایک ایک کوس کی مسافت پر ایک ایک مینار نمودار۔ ہر ایک چوکی پر تمام چیزیں مہیا۔ سودے والوں کی دکانیں جا بجا۔ مسافر خوش و خرم۔ کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے دن بھر چلے جاتے ہیں اور شام کو منزل پر بھی سب طرح کا آرام پاتے ہیں۔ بیت

جہاں دیکھئے خیر ہی خیر ہے سفر یہ نہیں باغ کی سیر ہے

سو اس کے راہ میں اگر سونا اچھالتے چلے جائیں کہیں خطرہ نہیں اور جنگل میں جہاں چاہیں سو رہیں کچھ پروا نہیں چنانچہ ہمیشہ سوداگر بنجارے مال و متاع غلہ دور دور سے بھر لاتے ہیں اور منزل مقصود پر سلامت جوں کا توں پہنچ جاتے ہیں،، آرائش محفل صفحہ (۲)

میر بہادر علی حسینی

میر بہادر علی حسینی فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم میں مشہور تو بہت ہیں لیکن عام طور پر اُن کے حالات کا کوئی علم نہیں۔ ہمارے تذکرہ نویسوں نے اس کالج کے دیگر مولفین کی طرح اُن کے ساتھ بھی بے حد بے اعتنائی کی ہے اسی وجہ سے اُن کے حالات کا پتہ چلانا سخت مشکل ہے۔ اتفاق سے ہم کو اُن کی تالیفات اور منشی کریم الدین کے تذکرہ "طبقات الشعرائے ہند" اور چند متفرق ذرائع سے تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو گئیں۔ ان کے والد کا نام سید عبد اللہ کاظم ہے اور یہ وہی صاحب ہیں جن کی حسن سعی و اہتمام سے حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلوی (۱۱۶۷ھ ۔ ۱۲۳۰ھ) کا اردو ترجمہ قرآن مجید پہلی بار شائع ہوا تھا۔ ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ حسینی خاص دہلی کے باشندے ہیں یا کسی اور شہر کے۔ مگر بعض شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن شاہجہاں آباد دہلی تھا۔ حضرت شاہ عبد القادر صاحب دہلی میں تشریف رکھتے تھے اور آپ کے رشد و ہدایت سے خاص طور پر اہل دہلی مستفید ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ "ترجمۃ القرآن" کا پہلا ایڈیشن بھی جو حسینی کے والد کے اہتمام سے شائع ہوا تھا دہلی ہی میں طبع ہوا۔ اس بنا پر خیال ہوتا ہے کہ حسینی دہلی کے باشندے تھے۔ اس کے علاوہ ایک اور شہادت یہ ہے کہ میر امن اپنی کتاب "باغ و بہار" کے دیباچہ میں فورٹ ولیم کالج میں

اپنے ملازم ہونے کا ذکر کرتے ہوے لکھتے ہیں "منشی میر بہادر علی جی کے وسیلہ سے حضور تک جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے رسائی ہوی" میر امن کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ حسینی سے ان کی گہری اور بے تکلف دوستی تھی۔ میر امن تو خاص دلی کے باشندے تھے جب وہ تلاش معاش میں دلی سے نکلے تو پہلے چند سال عظیم آباد میں گزارے اور پھر کلکتہ کا رخ کیا ان کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حسینی سے یا تو دلی ہی سے راہ و رسم رکھتے تھے یا ان کی ملاقات اور شناسائی عظیم آباد کی ہوگی مگر ہمارے نزدیک پہلا خیال مرجح ہے اور حسینی ضرور میر امن کے اہل وطن اور دلی ہی کے بے تکلف دوست ہونگے۔

میر امن کے محولہ بالا بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حسینی ان سے پہلے ہی فورٹ ولیم کالج کی سلک ملازمت میں منسلک ہو چکے تھے مگر ان کی تالیفات کا سلسلہ سنہ ۱۸۰۱ء م سنہ ۱۲۱۵ھ سے شروع ہوتا ہے اور ان کی آخری کتاب سنہ ۱۸۰۵ء میں ختم ہوی۔ معلوم نہیں کہ وہ کب تک اس کالج کے متوسل رہے۔ ان کے حالات کے متعلق ہمیں اس سے زیادہ اطلاع حاصل نہ ہو سکی۔ منشی کریم الدین نے ان کو شاعر اور "ذی قدر شاعر" بتایا ہے وہ حسینی تخلص کرتے تھے مگر ان کا ایک آدھ شعر بھی نہ مل سکا اور نہ خود کریم الدین نے نمونہ کلام دیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ پیشہ ور شاعر نہ ہوں بلکہ اس زمانہ کے عام شرفا اور تعلیم یافتہ اشخاص کی طرح تفنن طبع کے طور پر شعر گوئی کا مشغلہ رکھتے ہوں۔ اخلاق ہندی میں بعض بعض جگہ چند ابیات پائی جاتی ہیں غالباً انہی کی ہونگی مگر وہ ان کی

شاعری کا کوئی عمدہ نمونہ نہیں اور نہ وہ شاعر کی حیثیت سے قابل قدر ہیں
ان کے اصلی کارنامے ان کے دیگر ساتھیوں کی طرح نثری کتابیں ہیں اور
وہ حسبِ ذیل چار ہیں۔ (۱) نثر بے نظیر (۲) اخلاق ہندی (۳) تاریخ آسام
(۴) رسالہ گل کرسٹ اس کے علاوہ انہوں نے حکایات لقمان وغیرہ کے
ترجمہ میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی امداد کی اور قرآن مجید کے ترجمہ میں بھی حصہ
لیا ہے۔ پہلی دو کتابیں یعنے نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ایک ہی سال
کی لکھی ہوئی ہیں اور اُن کے ایک بیان سے جس کو ہم آگے نقل کر رہے
ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ نثر بے نظیر سب سے پہلے لکھی گئی ہے۔

نثر بے نظیر یہ اُردو کی شہرۂ آفاق مثنوی سحر البیان کا، جس میں
شہزادہ بے نظیر اور شہزادی بدر منیر کے عشق و محبت کی
دل آویز داستان بیان کی گئی ہے نثری خلاصہ ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے
نو آموزان اُردو کو مثنوی میر حسن کے مطالبے سے لطف اندوز کرنے اور اس
نظم کے مطالعہ میں سہولت بہم پہنچانے کی غرض سے اس کو نثر میں لکھوایا
تھا اس کی کیفیت خود ان کی زبان سے سنئے "قصہ بے نظیر و بدر منیر
کو نظم میں تصنیف کیا ہوا شاعر بے ہمتا، ادا بند یکتا، رونق بزم سخن،
میر حسن مرحوم متخلص بہ حسن، سعید ازلی خلف الرشید میر غلام حسین ضاحک
دہلوی کا تھا۔ فی الواقع ہر ایک مصرع اس کا فصاحت و بلاغت میں
بے نظیر ہے اور ہر ایک شعر حسن و خوبی میں مثل بدر منیر۔ جو سخندان
منصف مزاج عاشق پیشہ ہیں وہی اس کی طرز بخوبی پہچانتے ہیں۔"

مقابل اس کے نظم کس سے ہو سکے بلکہ کوئی ان رمزوں کو پا تو سکے ؎
قاصر ہے زباں اس کی توصیف میں ہر کہ دمہ مشغول ہے اس کی تعریف میں
اب اس کو عہد میں شاہ عالم بادشاہ کے اور ریاست امیر سراپا تدبیر......
.... مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کے ۱۲۱۷ ہجری
مطابق ۱۸۰۲ عیسوی کے حکم سے صاحب خداوند نعمت.......
جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام حشمتہ کے عاصی میر بہادر علی حسینی نے
شروع قصہ سے موافق محاورۂ خاص کے نثر میں لکھا ہے۔ پہلے اس سے
یہ خاکسار اس کہانی کو خاص و عام کی بول چال کے مطابق بہ طرز سہل
واسطے صاحبان نو آموز کے تحریر کر چکا تھا۔ اب جی میں یوں آئی کہ
اس داستان شیریں کو (کہ فی الحقیقت قصہ شیریں سے شیریں تر ہے) اس رویہ سے
نثر کروں کہ ہر ایک زباں داں و شاعر اس کو سن کر عش عش کرے اور
اس ہیچمدان کی ایک یادگاری اس دنیا میں رہے۔"
جیسا کہ ہم نے ابھی اوپر اشارہ کیا ہے حسینی نے اس کو اپنی یادگار
بتایا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت انہوں نے اپنی دوسری
کتابیں نہیں لکھی تھیں نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس قصہ کو ۱۸۰۲ء سے
قبل ہی غالباً مسودہ کی صورت میں مرتب کر کے اہل ذوق کو سنایا تھا
اور اُن کی پسندیدگی حاصل کی تھی بظاہر یہ اُن کا کوئی شاندار کارنامہ
نہیں معلوم ہوتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک پرلطف چیز
ہے میر حسن کی اصل مثنوی میں جو لطف ہے وہ یقیناً کسی طرح اس نثری

خلاصہ میں نہیں آسکتا مگر حسینی نے دو دو چار چار فقروں کے بعد اصل مثنوی کے
ایک ایک دو دو شعر بھی لکھ دئے ہیں جو نثر کے حسن کو دوبالا کر دیتے ہیں
اور اس طرح یہ نثری خلاصہ بھی دلچسپی اور لطف سے خالی نہیں۔ چونکہ یہ کتاب
کمپنی کے یوروپین ملازمین کی خاص تعلیمی ضروریات کے مدنظر لکھوائی گئی تھی
اور اس کو اٹر دو دوائی کے اعلیٰ نصاب میں اصل مثنوی کے ساتھ شریک کیا گیا
تھا اس لیے ڈاکٹر گل کرسٹ کے اہتمام سے اصل مثنوی کے ساتھ ہی ۱۸۰۳ء
میں شائع ہوئی۔ گل کرسٹ نے اپنی "بیاض ہندی" میں اس کا بھی ایک نمونہ
چھاپا ہے دوسرے ایڈیشن کے وقت پر میر شیر علی افسوس نے گل کرسٹ کے
ایماء سے اس کی نظر ثانی بھی کی اور اس کے بعد متعدد ایڈیشن ہندوستانی
مطابع سے شائع ہوئے۔ کتاب بہت مقبول ہوئی اور انگریزی میں ایم ایچ
کورٹ نے اس کا ترجمہ بھی کر کے ۱۸۷۱ء میں شملہ سے شائع کیا۔ آج کل
اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ برٹش میوزیم میں ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے۔
بڑی سعی و تلاش کے بعد ہم کو ایک نسخہ حاصل ہوا یہ کالج پریس کلکتہ کا مطبوعہ
۱۸۰۷ء کی چھوٹی تقطیع کے ۱۵۲ صفحات پر مشتمل اور ٹائپ میں چھپا ہوا ہے۔
ذیل میں چند سطریں "داستان سواری کی تیاری" سے بطور نمونہ درج
کی جاتی ہیں:۔

"جب گیارہ برس خیریت سے گزرے بارہواں برس آیا الحمد للہ!
جس دن کی آرزو تھی سو کریم نے ساتھ خوشی کے دکھایا۔ شادی محل میں
چاروں طرف مچ گئی۔ مبارک بادی کی صدا پھر بلند ہوئی۔ نظم

پڑی جب گرہ بارہویں سال کی کھلی گلجھڑی غم کے جنجال کی

چار گھڑی دن رہے عرض بیگی کو بادشاہ نے ارشاد کیا کہ صبح سواری مبارک جلوس سے تیار ہو کہ میں شہزادے کو لے کر سوار ہونگا۔ تا رعیت اور سپاہ اس کا دیدار دیکھ کر شاد ہو اور بستی ان کے دل کی بھی آباد ہو تم نقیبوں کو تقید کرو گھر گھر یہ حکم پہنچا ویں اور ہر ایک چھوٹے بڑے کو جتا دیں کہ زرق برق سے نکلے اور تمام اسباب سواری کا بھی نیا اور جگمگاتا ہو۔ خبردار ایک سوار میلا اور ایک گھوڑے کا زین پرانا نظر نہ آوے احیاناً کسی کو اس وقت اگر کوئی چیز میسر نہ آوے تو سرکار سے بے تکلف لیوے کہ ما بدولت کی مرضی اور خوشی اسی میں ہے (نظم)

کریں شہر کو مل کے آئینہ بند سواری کا ہو نور جس سے دوچند

اتنے میں شام پڑی۔ آفتاب والشمس پڑھ کے سجدۂ شکر میں گیا۔ مہتاب سورۂ نور پڑھتا ہوا نکلا۔ حضرت محل میں تشریف لے گئے تمام رات ناچ راگ رہا۔ مارے خوشی کے محل میں کوئی نہ سویا (نظم)

عجب شب تھی وہ جوں سحر رو سفید عجب روز تھا مثل روز امید

القصہ رات آخر ہوی۔ چاند بالیں استراحت پر اپنا سر رکھا اور سورج بڑی چمک سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ (نظم)

کہا شاہ نے اپنے فرزند کو کہ بابا نہا دھو کے تیار ہو

پلا آتشیں آب پیر مغاں کہ بھولے مجھے گرم و سرد جہاں

اگر چاہتا ہو مرے دل کو چین نہ دنیا وہ ساغر جو ہو قلتین"

(نثر بے نظیر مطبوعہ ۱۸۷۶ء ص ۲۷)

اخلاق ہندی

یہ بہادر علی حسینی کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ ہے اور حقیقت میں ان کا نام بھی نثر بے نظیر اور اخلاق ہندی ہی سے زندہ ہے "اخلاق ہندی" در اصل زمانہ قدیم میں ہتو پدیش کے نام سے سنسکرت میں لکھی گئی تھی۔ فارسی میں اس کے دو تین ترجمے ہوئے ایک ترجمہ جو عام طور پر بہت مشہور ہے "نگار دانش" کے نام سے موسوم ہے اور دوسرے کا نام "مفرح القلوب" ہے یہ مفتی تاج الدین کا ترجمہ ہے۔ آخر الذکر ترجمہ بھی ایک زمانہ میں کافی شہرت رکھتا تھا مگر آج کل اسے کوئی جانتا بھی نہیں حسینی نے اخلاق ہندی کے دیباچہ میں اس کی تالیف کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے "کتاب سرکار دولت مدار میں ملک الملوک شاہ نصیر الدین کے جس کی تخت گاہ صوبہ بہار تھی پہنچی جب انہوں نے سُنا اس میں قصے ازبسکہ دلچسپ ہیں اور نصیحت میں نہایت مرغوب اور باتیں خوب اور حکایتیں اکثر مفید تب اپنے ملازموں میں سے ایک کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا کہ اس کو ترجمہ سلیس فارسی میں کرو تو میں اپنے مطالعہ میں رکھوں اور اس کے مضمون سے مستفید ہوں۔ تب اُن میں سے ایک شخص (مفتی تاج الدین) حکم بجالایا اور نام اس کا مُفرح القلوب رکھا۔"

نگار دانش اور مفرح القلوب کے تقریباً تمام قصے ایک ہی ہونے کے باوجود اشخاص قصہ کے اسماء جداگانہ ہیں اور ایک دوسرا فرق یہ ہے کہ نگار دانش میں بید پائے برہمن رائے دابشلیم سے قصے بیان

کرتا ہے اور مفرح القلوب میں ان قصوں کا راوی پنڈت بشن سرما ہے اور ساری داستان کی تقریب یہ بیان کی گئی ہے کہ گنگا کنارے مانک پور نام ایک شہر آباد تھا اور وہاں کا راجہ چندرسین نہایت سخی عادل اور اولوالعزم تھا مگر اس کے بیٹے نہایت بدتمیز اور نالائق تھے راجہ ان کی بیہودہ حرکتیں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا تھا مگر کوئی تدبیر ان کو راہ پر لانے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آخر ایک روز سر دربار ان کی بے ادبانہ حرکات دیکھ کر اپنے درباریوں سے مشورہ کیا ایک درباری پنڈت بشن سرما نے اُن کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا اور ان کو اپنے ہمراہ گھر لایا یہاں اُن سے وہ تمام سبق آموز اور عبرت انگیز قصے بیان کیے جو اس کتاب میں مندرج ہیں۔ ان قصوں کو سُن کر راجہ کے لڑکے نیکی اور علم کی طرف مائل ہوئے اور راجہ نے خوش ہو کر اس پنڈت کو بہت سا دان دچھنا اور خلعت انعام دیا۔ غرض یہ صاف ظاہر ہے کہ فارسی کے دونوں مترجموں کے پیش نظر علیحدہ علیحدہ سنسکرت کے نسخے ہیں۔

بہادر علی حسینی نے ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے فرمانے سے مفرح القلوب کو "سلیس رواجی ریختہ" میں ترجمہ کر کے "اخلاق ہندی" کے نام سے موسوم کیا۔ "اخلاق ہندی" چار ابواب پر مشتمل ہے "پہلے باب میں ذکر دوستی کا۔ دوسرے میں دوستوں کی جدائی کا۔ تیسرے میں لڑائی کی ایسی باتوں کا جو اپنی فتح ہو اور مخالف کی شکست۔ چوتھے میں کیفیت ملاپ کی خواہ لڑائی کے آگے ہو یا پیچھے"

"اخلاق ہندی" کا ایک طویل اقتباس سب سے پہلے ڈاکٹر
گل کرسٹ کی "بیاض ہندی" میں چھاپا گیا۔ پھر اسی سال یعنی ۱۸۰۳ء
میں کلکتہ میں پوری کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی اور ایک عرصہ دراز تک
مقبول خاص و عام رہی۔ سر جارج گریرسن کی کتاب "لنگوسٹک سروے
آف انڈیا" میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی جو فہرست دی گئی ہے اس سے
معلوم ہوتا ہے کہ کم و بیش پچاس سال میں اس کے دس بارہ ایڈیشن
بمبئی، مدراس، بنگلور، کلکتہ اور لندن وغیرہ میں چھپے ہیں۔ ہمارے
پیش نظر نسخہ بھی بمبئی کے مطبع فتح الکریم میں ۱۳۰۵ھ میں چھپا ہے جو ہمیں
اپنے مکرم دوست مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ سے دستیاب
ہوا ہے ۱۸۶۳ء میں ایک صاحب سید عبد اللہ ناصی نے اس کا ایک
نفیس ایڈیشن نہایت آب و تاب کے ساتھ شائع کیا تھا اس میں تمہید
اور حاشیہ بھی تھا۔ خود مولف کے زمانہ کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم
میں محفوظ ہے۔ آج کل اس کے نسخے بہت کم پائے جاتے [illegible] اول تو ان دنوں
ایسی قدیم اور اوراق پارینہ کی حیثیت رکھنے والی کتابوں کو کوئی پوچھتا
ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ یہ کتاب ایسی دائمی مقبولیت نہیں حاصل
کر سکتی جیسی کہ باغ و بہار کو نصیب ہوئی۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے معلوم
ہوتا ہے کہ مفرح القلوب ایک زمانہ میں خوب مشہور تھی۔ قدیم اردو
(دکھنی) میں بھی اس کا ایک ترجمہ ہوا ہے جس کو شیخ محمد یحیی لبیدری نے
۱۱۷۶ھ میں کیا اس ترجمہ کا نام بھی مفرح القلوب ہے اس کا طرز بیان

اور زبان بہت سلجھی ہوئی اور صاف ہے اس کا بھی ایک قلمی نسخہ ہمارے دوست مولوی عمر یافعی صاحب کے کتب خانہ میں ہے۔

بہادر علی حسینی کا طرز بیان بالکل سیدھا سادہ ہے مگر اس میں کوئی خاص دلکشی نہیں وہ مسلسل فقرے لکھتے جاتے ہیں مگر پڑھنے والا ان کے اتار چڑھاؤ سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی زبان نہایت سلیس اور صاف ہے لیکن پھیکی ضرور ہے میر امن تو کیا شیر علی افسوس کے طرز بیان میں جو لوچ اور گھلاوٹ ہے وہ ان کے ہاں نہیں پائی جاتی قصہ کہانی کی زبان میں محاورہ اور روزمرہ کی چاشنی کے بغیر لطف پیدا کرنا سخت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زبان میں فرسودگی اور کہنگی پائی جاتی ہے۔ وہ قواعد کے بڑے پابند ہیں اور کبھی اضافتیں وغیرہ حذف کرنا پسند نہیں کرتے ان کے فقرے طولانی اور قواعد زبان کے لحاظ سے بالکل صحیح ہوتے ہیں مگر اس سے پڑھنے والے کا جی اکتا جاتا ہے اگر وہ مکالمہ کے موقعوں پر بول چال کے چھوٹے چھوٹے مگر پر لطف فقرے استعمال کرتے تو شاید اس سے قصہ کی دلچسپی میں اضافہ ہو جاتا اخلاق ہندی میں نہ تو عربی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ ہندی الفاظ ہی کی بھرمار ہے بلکہ دونوں کو ایک خاص توازن سے نہایت احتیاط کے ساتھ برتا ہے اسی وجہ سے وہ دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "سلیس ہندی ریختہ" میں ترجمہ کیا ہے:۔

ذیل میں ایک حکایت نقل کی جاتی ہے جس سے ان کے طرز بیان کی

خصوصیتیں ظاہر ہو جائینگی۔

۱۰) ایک پُرانا سانپ کہ اس میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ رہی تھی ایک جھیل کے کنارے پر آہستہ آہستہ آکر غمگین ہو بیٹھا۔ تب مینڈکوں کے بادشاہ نے اُس سے پوچھا اے سانپ تجھے کیا ہوا ہے جو اتنا دلگیر ہے اس نے جواب دیا کہ تجھے پرائی کیا پڑی تو اپنی نبھیڑ مینڈک بولا۔ اے سانپ ناخوش کیوں ہوتا ہے اگر کچھ تیری چیز پانی میں گر پڑی ہو تو کہہ دے اپنے لشکر کو حکم کروں کہ بجنسہٖ اُس چیز کو ڈھونڈ لاوے۔ اس نے کہا اے مینڈک اس شہر میں ایک برہمن کا لڑکا بہت خوبصورت تھا اس کو میں نے کاٹا۔ ماں باپ نے اس کے درد سے کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ اس کے بھائی نے اس کو سمجھا بجھا کر کھلایا پلایا۔ یوں اُسے نصیحت کی کہ بھائی صبر کیجیے۔ سب کی یہی راہ ہے چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے۔ شعر[۱]

مت پوچھ رفتگاں کو کدھر تھے کہاں تھیں ‏ ‏ شاہان نامور اور دلہنیں جو نوجواں تھیں

تب برہمن یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ اے دوستو میں اس گاؤں میں نہ رہونگا کس واسطے کہ یہی ایک لڑکا میرا تھا سو خدا کی راہ میں گیا۔ اب مجھے بستی سے کیا کام۔ بن باسی رہونگا۔ تب انہوں نے کہا اے بھائی کوئی ڈاڑھی منڈھانے اور جامہ پھاڑ کر جنگل میں جا رہنے سے ساد ہو نہیں ہوتا مگر جس کی کرنی اچھی ہو۔ سوائے مینڈک میں نے

۱؎ شعر کی پوری نقل ہے!

اس وقت خواب دیکھا کہ ایک مرد بوڑھا نہایت بزرگ صورت مجھ سے
یوں کہتا ہے کہ اے سانپ تو نے اس لڑکے بمنے کو ناحق کاٹا کل قیامت کو
تیری پیٹھ پر مینڈک سوار ہونگے اور اسی عذاب میں ہمیشہ خدا تجھے
گرفتار رکھے گا۔ اگر اس عذاب سے اپنا چھٹکارا چاہے تو کنارے
جھیل کے جہاں مینڈک بہت سے ہوں جا کر اُن کے سردار کو اپنی
گردن پر سوار کر کے لیے پھرا کر۔ مینڈک یہ بات سنتے ہی نہایت خوش
ہو کر اپنے دل میں کہنے لگا کہ خدا نے مجھے مفت یہ گھوڑا دیا شاید میرے
طالعوں کی مدد سے ایسی سواری ملی۔ اسی وقت سانپ کے پیٹھ پر
چڑھ بیٹھا اور کہا فلانی جگہ میرا دشمن ہے اگر تو تصدیع کر کے مجھے
وہاں تک لے چلے تو میں اُسے ماروں۔ سانپ نے یہ بات مانی۔
سب مینڈکوں کو اپنی جلو میں آگے رکھ کے چلا۔ جب اُس تالاب کو
چھوڑ کر آگے بڑھے سانپ نے جانا کہ اب یہ بھاگ کر اس تالاب
تک نہیں پہنچ سکینگے۔ کسی بہانہ زمین پر اپنے کو گرا دیا مینڈکوں
کے سردار نے پوچھا تو کیوں گر پڑا اُس نے کہا کہ تیری فوج کو دیکھ کر
مجھے بھوک لگی ہے۔ وہ بولا کہ میرے لشکر سے دو چار مینڈکوں کو
کھالے۔ سانپ نے کہا اے بادشاہ لشکر کم ہونے سے تجھ کو برا لگیگا
وہ بولا تیرے کھانے سے میری فوج کم نہ ہوگی سانپ ہر روز دو
تین مینڈک کھانے لگا۔ تھوڑے دنوں میں سب کو نگل گیا۔ اکیلا
بادشاہ رہا۔ سانپ نے پوچھا اے بادشاہ آج میں کیا کھاؤں

مجھے بھوک لگی ہے۔ مینڈک نے کہا اے سانپ کسی جھیل کے کنارے
چل کر اپنا پیٹ بھر لے۔ تب اس نے کہا تمہارے لشکر نے میرے
پیٹ میں چھاونی کی ہے بادشاہ کا لشکر سے جدا رہنا خوب نہیں
اپنی فوج کے ساتھ آپ بھی اسی چھاونی میں داخل ہوں تو بہتر ہے
تب وہ اپنی موت سمجھ کر چپ ہو رہا۔ سانپ نے اپنے شہسوار کو
زمین پر پٹک کر کوڑے دم کے مارے اور کھا گیا جیسا کہ کسو شاعر
نے کہا ہے۔ فرد

گردن بندگی نت خم ہو در فرماں پر گوے سر اپنا خدا کیوں نہ کری چوگاں پر"

(اخلاق ہندی مطبوعہ ۱۳۰۵ھ ص ۱۷۰)

تاریخ آسام

بہادر علی حسینی کا تیسرا کارنامہ تاریخ آسام ہے یہ شہاب الدین طالش ابن ولی محمد کی فارسی تاریخ آسام کا اردو ترجمہ ہے منشی کریم الدین نے طبقات الشعرائے ہند میں لکھا ہے کہ اس کا ترجمہ ۱۸۰۵ء میں تمام ہوا یہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے جرنیل میر جملہ کی اس مہم آسام کی تفصیلی تاریخ ہے جو ۱۶۶۲ء میں فتح ہوئی تھی۔ واقعات مہم کے ضمن میں آسام کی قدیم تاریخ اور مختلف حکومتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شہاب الدین طالش خود اس مہم میں شریک تھا اور اس نے جو واقعات و حالات لکھے ہیں وہ اس کے چشم دید ہیں اور اس لحاظ سے نہایت معتبر و مستند کہے جا سکتے ہیں۔ اصل فارسی تاریخ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں موجود ہے بہادر علی کا ترجمہ بالکل نایاب ہو گیا ہے اس کا

کوئی نسخہ نہ مل سکا البتہ مولوی نصیرالدین صاحب ہاشمی مؤلف "دکن میں اُردو" کا بیان ہے کہ پیرس کے قومی کتب خانہ (ببلیاتھک نیشنل) میں اس کا قلمی نسخہ محفوظ ہے۔ انھوں نے اس سے یہ عبارت نمونتاً اپنے مضمون میں شایع کی ہے۔

"شہر رجب کی بیسویں تاریخ کلیا بر سے کوچ ہوا۔ آگے وہاں سے منزل تک لشکر کا کنارہ پکڑ کر چلنا بہ باعث تیزی ندی کے سبب جو پہاڑ کے جھرنیں کو ہوکر بہی ہے مقدور نہ تھا۔ اس لیے لشکر اور نواڑی کے درمیان بڑا بیچ پڑ گیا۔ ابن حسین نواڑی کا داروغہ جو تھا سو نواب کے حکم سے کچھ بعضی بعضی کام سنوارنے کے لیے فتح نشان چند دن کے ساتھ رہ گیا تھا۔"

گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ ایک شخص ٹی پی وے نے اس تاریخ کو فرانسیسی میں ترجمہ کر کے ۱۸۴۵ء میں شایع کیا تھا۔

رسالہ گل کرسٹ بہادر علی حسینی کی ایک اور قابل ذکر تالیف "قواعد زبان اُردو" مشہور "رسالہ گل کرسٹ" ہے یہ دراصل ڈاکٹر گل کرسٹ کی کتاب "ہندوستانی کی صرف و نحو" کا ملخص ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے اردو زبان کے قواعد اور اس وقت کے موجودہ کتب صرف و نحو کا مطالعہ کر کے ایک بسیط کتاب "ہندوستانی کی صرف و نحو" کے نام سے ۱۷۹۶ء میں مرتب کی تھی۔ یہ فورٹ ولیم کالج کے نصاب میں داخل تھی مگر اس کی ضخامت کی وجہ سے متعلمین کو اس کے از بر کرنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔ حسینی نے رفع مشکلات کے خیال سے اس کو نہایت مختصر طور پر ملخص کر دیا۔ یہ رسالہ ۱۸۱۶ء میں کلکتہ سے

شائع ہوا تھا۔ غالباً اس کے بہت کم ایڈیشن نکلے۔ آج یورپ کے بڑے بڑے کتب خانے بھی اس سے خالی ہیں اور اب اس کے نسخوں کا دستیاب ہونا مشکل ہے ہمارے دوست مولوی عمر یافعی صاحب حیدر آبادی کے ہاں اس کے دو نسخے ہیں ایک قلمی محررہ سنہ ۱۲۵۳ھ اور دوسرا مطبوعہ سنہ ۱۸۷۲ء۔ مطبوعہ نسخے کے آخری چار پانچ صفحات غائب ہیں۔

یہ رسالہ دو مقالوں پر مشتمل ہے مقالہ اول میں مفردات اور دوم میں مرکبات سے بحث کی گئی ہے۔ مفردات کے تحت علم صرف کے تقریباً تمام مسائل آگئے ہیں اور مرکبات میں مرکب تام و ناقص کی جملہ اقسام کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثالوں کے لیے بعض جگہ اساتذہ کے اشعار دئے گئے ہیں تذکیر و تانیث کے اہم حصہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اردو زبان کی تحقیقات کرنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ ازبس ضروری اور مفید ہے ایک خاص بات یہ ہے کہ بعض متاخر قواعد نویسوں کے برخلاف اس کی بنیاد فارسی قواعد کے تتبع پر رکھی گئی ہے اور تقریباً ترتیب بھی فارسی قواعد کی ہے۔

اہل زبان نے نثر نویسی کی طرح قواعد کی کتابوں کی طرف سے بھی بالکل بے اعتنائی برتی اور کبھی اپنے طور پر اس کی جانب توجہ نہیں کی اردو کی قواعد پر سب سے پہلے غالباً اہل یورپ نے ہی کتابیں لکھی ہیں اور ایک عرصہ تک انھی کی کتابیں اردو سیکھنے والوں کی رہنمائی [illegible] اہل ہند میں اس مضمون پر سب سے پہلے سید انشاء اللہ خاں دہلوی نے قلم اٹھایا اور

۱۲۲۳ھ م ۱۸۰۸ء میں نواب سعادت علی خاں والی اودھ کے عہد حکومت میں دریائے لطافت لکھی۔ "رسالہ گل کرسٹ" اگرچہ اصل میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی محنت اور تحقیقات کا ثمرہ ہے مگر بہادر علی حسینی نے اس کا خلاصہ کرکے اس مضمون کے مولفوں میں اپنے لئے بھی ایک جگہ نکال لی اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی اصل کتاب کے کم یاب ہوجانے سے ان کے خلاصہ کو اس کی جگہ مل گئی اور وہ خود قابل قدر بن گیا۔

ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس خیال سے کہ انگریزی لٹریچر کے مطالعہ میں اکثر قرآن شریف کی تلمیحات نظر سے گزرتی ہیں اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لیے قرآن شریف سے واقف ہونا ضروری ہے کالج کی جانب سے اس کے بھی اُردو ترجمہ کا اہتمام کیا اور اس کام کے لیے پہلے بہادر علی حسینی اور مولوی امانت اللہ کو مقرر کیا اور پھر کاظم علی جوان اور دیگر علما کو بھی اس کی تصحیح و نظر ثانی وغیرہ کا کام سپرد کیا۔ یہ کام اُن کے زمانہ میں برابر جاری رہا مگر ۱۸۰۴ء کے اواخر میں ان کے وطن واپس چلے جانے پر ان کے جانشینوں نے اپنے تعصب و تنگ نظری سے اس کام کو یک قلم موقوف کرادیا اور جو کچھ حصہ ترجمہ ہوچکا تھا اس کو بھی کالج کی جانب سے طبع نہیں کرایا۔ حسن اتفاق سے مولوی امانت اللہ نے جن پاروں کا ترجمہ کیا تھا وہ کسی اور شخص کی سعی سے جس کو کالج سے کچھ تعلق نہیں معلوم ہوتا شائع ہوگیا مگر بہادر علی کا کارنامہ محفوظ نہ رہ سکا اور اس وقت یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ انہوں نے کن پاروں کا ترجمہ کیا۔

مرزا علی لُطف

مولوی عبداللہ خاں سابق منتظم کتب خانہ آصفیہ نے لطف کا
تذکرہ گلشن ہند شایع کرکے ان کو اردو ادبیات میں ہمیشہ کے لیے
مشہور کردیا نثر میں لطف کا یہی ایک کارنامہ ہے۔ بحیثیت شاعر
گو وہ بلند پایہ نہ تھے مگر مشہور ضرور تھے۔ گلشن بے خار اور سخن شعرا
میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی عبدالجبار خاں صاحب
صوفی حیدرآبادی نے بھی اپنے مبسوط اور معرکۃ الآرا تذکرہ موسوم
محبوب الزمن میں ان کا نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے
اور خود انھوں نے اپنے تذکرہ میں اپنی نسبت چند سرسری
باتیں بیان کی ہیں اور یہ کہہ کر کہ "اب آگے بیان امورات دنیوی
باعث ہے طول کلام کا اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خاص و عام کا"
اپنے حالات ختم کردیے اور کسی قدر انکسار اور ہیچمدانی کا اظہار
کرتے ہوئے اپنے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ نقل کردیا ہے۔
اپنے حالات کے بالتفصیل نہ بیان کرنے کی وجہ تو خود نمائی سے
احتراز اور منکسر المزاجی ہے اور دوسری یہ کہ اس زمانہ کے
اکثر لوگ اُن سے اور اُن کے خاندانی حالات سے واقف تھے
ان کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہ سمجھی

ان کا نام مرزا علی اور لطف تخلص تھا۔ ان کے والد کا نام

مرزا کاظم بیگ خاں تھا اور وہ ہجری تخلص کرتے تھے لطف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی غزل گوئی میں اُن کو یدطولیٰ حاصل تھا ہجری نے اردو میں کوئی شعر نہیں لکھا۔ لطف کے آبا و اجداد استرآباد کے باشندے تھے۔ ان کے والد ۱۱۵۴ھ میں نادرشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے اور شاہ جہاں آباد میں سکونت اختیار کی اور پھر اسی کو وطن بنا لیا۔ نواب آصف الدولہ وزیر اودھ کے دادا ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے جو ان سے استرآباد کی سکونت کے زمانہ میں دوستی رکھتے تھے، بادشاہ وقت کے دربار میں رسائی پائی اور اپنے کمالات ذاتی کی بناء پر مورد عنایات بادشاہی ہوئے۔

مرزا علی لطف دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا سنہ ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا۔ ان کی نشوونما اور تعلیم و تربیت بھی دہلی ہی میں ہوئی۔ ابتدا سے تحصیل علوم کا شوق تھا۔ ارباب علم و فضل کے فیض صحبت سے عنفوان شباب میں علوم متداولہ حاصل کر لیے۔ پھر شعر و شاعری کا شوق ہوا۔ اردو، فارسی میں شعر لکھنے لگے۔ فارسی کلام کی اصلاح تو اپنے والد سے لی مگر اردو اصلاح کے متعلق تذکرہ نویسوں میں اختلاف رائے ہے وہ خود لکھتے ہیں کہ "مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے ہے۔" مگر مصطفےٰ خاں شیفتہ نے یہ بیان کرتے ہوئے کہ انہوں نے لطف کا تذکرہ دیکھا ہے ان کو میر تقی میر کا شاگرد لکھا ہے۔

مؤلف محبوب الزمن نے بھی غالباً ان ہی کے بیان پر میر کا شاگرد بتایا ہے مگر ناسخ مؤلف سخن شعرا نے صاف لکھدیا ہے صاحب گلشن بے خار نے جوان کو شاگرد میر تقی کا لکھا ہے غلطی کی ہے اور علی الرغم ان کو مرزا رفیع سودا کا شاگرد بتایا ہے۔ مؤلف مجموعہ نغز کا بھی یہی کہنا ہے مصحفی نے ان کی شاگردی کی نسبت کوئی صاف بات نہیں بیان کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لطف کو میر تقی اور مرزا سودا سے کمال عقیدت ہے اور ہونی بھی چاہیے مگر اس کے باوجود اپنے آپ کو ان دونوں میں سے کسی کا بھی شاگرد نہیں بتاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ انہوں نے میر تقی یا مرزا سودا کے آگے ابتدائے مشق سخن کے زمانہ میں زانوئے شاگردی تہ کیا ہو۔ بہر حال ان کے تلمذ کا مسئلہ متنازع فیہ ہے۔

لطف دہلی کی تباہی کے بعد بھی ایک عرصہ تک دہلی ہی میں رہے بالآخران کو آوارۂ وطن ہونا پڑا۔ اس زمانہ میں لکھنو اور حیدرآباد ہی دو ایسے علم وفن اور دولت وحکومت کے مرکز تھے کہ جو کوئی دہلی سے نکلتا انہی دو مقاموں میں سے کسی ایک کا رُخ کرتا۔ لکھنو دہلی سے قریب ہونے کی وجہ سے دہلی کے اکثر شاعر اور ادیب وہیں آکر بس گئے مگر جس زمانہ میں انہوں نے تلاش معاش میں دہلی کو خیرباد کہا اور سفر کا ارادہ کیا۔ لکھنو میں کچھ زیادہ قدر افزائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی اسی لیے

انہوں نے حیدر آباد جانے کا تہیہ کیا۔ وہ گلشن ہند میں مرزا جواں بخت ولی عہد شاہ عالم بہادر کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ شہزادہ نے ان کو اپنے ہاں حاضر ہو کر کلام سنانے اور اپنے شاعرے میں غزل پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ عذر و معذرت کرنے لگے مگر ان کا عذر پذیرا نہ ہوا اور شہزادہ کے پے در پے تقاضوں پر بالآخر نواب آصف الدولہ کے ایما سے حاضر ہونا پڑا۔ شہزادہ نے قدر افزائی کی اور اشعار سُن کر داد دی۔ اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لطف نے لکھنو کی بھی صحبتیں دیکھی ہیں مگر غالباً وہاں ان کی ایسی قدر دانی نہیں ہوئی جیسی وہ چاہتے تھے۔ اور ہوتی بھی تو کیسے۔ آصف الدولہ کا آخری زمانہ اور لکھنو میں شعرا کی کثرت۔ یہ بیچارے کس گنتی اور شمار میں پھر بھی جو کچھ ہوا غنیمت تھا۔

الغرض لطف نے حیدر آباد کے سفر کا ارادہ کیا اور حیدر آباد عظیم آباد پٹنہ میں گزار کر بنگال کی سیاحت کرتے ہوئے دکن آنا چاہتے تھے کہ کلکتہ میں ڈاکٹر گل کرسٹ سے ملاقات ہوئی اور ان کی فرمائش پر ۱۸۰۱ء میں تذکرہ گلشن ہند مرتب کیا۔ تذکرہ کے دیباچہ میں بھی اپنے حیدر آباد جانے کے ارادہ کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے گلشن ہند کے مقدمہ میں لطف کے بعض قصائد کی بنا پر جن کو ہم آگے نقل کریں گے۔ یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لطف اس فرمائش کے بعد نہیں تو اول ضرور حیدر آباد میں تھے مگر یہ خیال

اصل واقعہ کے خلاف ہے۔ دراصل لطف تذکرہ کی تدوین کے
بعد دکن آئے۔

اس وقت حیدرآباد صانہا اللہ عن الشرور والفتن کے
تخت حکومت پر نواب میر نظام علی خاں بہادر آصف جاہ ثانی جلوہ فرما
تھے اور اعظم الامراء ارسطو جاہ بہادر مدارالمہام تھے۔ اگرچہ یہ زمانہ
حیدرآباد کے لیے کچھ زیادہ امن و سکون کا نہ تھا اور نواب آصف جاہ
بہادر کو باغیوں کی سرکوبی اور انگریزوں کی امداد میں پے در پے
مہمیں روانہ کرنی پڑتی تھیں اور وہ خود بھی بہ نفس نفیس ان جنگوں
میں شریک رہتے تھے تاہم دکن میں اس زمانہ میں شعر و شاعری
کا چرچا گھر گھر تھا بادشاہ اور امراء دونوں شعراء کی قدردانی میں
داد فیاضی دے رہے تھے۔ اور شمالی ہند کے اکثر شعراء دکن میں
آکر دولت سے مالا مال ہو رہے تھے یہاں کی بزم شاعری
میں ان دنوں ایک دو نہیں کئی ایک شاعر ممتاز تھے ان
کی صیت سخن شمالی ہند میں دور دور تک پہنچی ہوئی تھی ان کی
غزلیں ارمغان کے طور پر لوگ شمالی ہند لیجاتے اور داد سخن
دیتے تھے۔ امراء کی شعراء نوازی و غربا پروری نے شمالی ہند
کے ایک نہیں بیسیوں شاعروں اور ادیبوں کو اس زمانہ
میں دکن کی خاک کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

مرزا علی لطف سنہ ۱۲۱۵ھ میں گلشن ہند کی تالیف سے

فارغ ہو کر حیدر آباد آئے اور نواب آصفجاہ بہادر اور اعظم الامراء
ارسطو جاہ کی مدح میں قصائد لکھ کر گزرانے ان کی آمد کی
شہرت ہوئی تو شعرائے دکن نے معاصرانہ فراغ دلی سے کام
لے کر استقبال کیا اور وہ حیدر آباد کے مشاعروں میں غزلیں
پڑھنے لگے۔ اس زمانہ کے دکنی شعراء میں شیر محمد خاں ایمان
بہت ممتاز تھے ان سے لطف کی اچھی راہ و رسم تھی سرکار عالی
سے ازراہِ قدردانی چار سو روپیہ ماہوار اور ایک پالکی عطا ہوئی۔
اعظم الامراء نے ان کی بذلہ سنجی و لطیفہ گوئی سے محظوظ ہو کر اپنے
مصاحبوں میں شریک کر لیا اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر
کی۔

لطف نے نواب ارسطو جاہ کی مدح میں کئی قصیدے
لکھے ہیں۔ ایک مرتبہ یہاں کے امراء کی ضرب المثل فیاضیوں
کو دیکھ کر اضافہ کی درخواست کرتے ہیں اور اسی مشہور بحر میں
جس میں مرزا غالب نے بہادر شاہ کے آگے اپنی استدعا
پیش کی تھی ایک قصیدہ کہہ کر گزرانتے ہیں اس میں ارسطو جاہ
کی غیر معمولی فیاضی اور نکتہ کو کتاب کے مول خریدنے
اور پھر ناصر علی سرہندی کے ایک مطلع پر امیر الامراء
ذو الفقار خاں کی بے انتہا بخشش کا ذکر کر کے کس حسن
طلب کے ساتھ اظہار مدعا کیا ہے ملاحظہ ہو۔

بخشش نے تیری رشکِ بیاباں کیا بحار ہمت سے تیری غیرتِ دریا ہے کوہسار

ہو غرقِ موجِ آب گہر کشتیِ سپہر عمان کف سے ہو تیری گر ابر مایہ دار

سائل ترے کے دھیان میں مژگان ہو رہے موہوم حسنِ حصولِ تمنا کا ہوئے تار

تیرے کرم کے روبرو وہ رشتۂ عطا حق اسمٰعیل کے حبل متیں سے ہے استوار

ہو ٹھے اگر تو گرمِ تماشا یہ چشمِ فیض ہر سبزہ زار سے ہو گلریز کا انبار

اہلِ ہنر کو پر تو کلفت کی گرد کیں مانع نہ ہو سواد کا تیرے خطِ غبار

گر مہر قدر دانی کا تیرے نہ ہو فروغ ہو روزِ علم آج شبِ جہل سے بھی تار

روز و غا نہیب سے تیرے صفِ عدو برہم ہو بادِ تند سے جوں ہور کی قطار

قبضہ کماں کا گر ترے آگے کرے حریف ڈھل جائے اس کا تیر وہیں اسکو شکل مار

کیا خاک پھر بجھے لبِ زخمِ عدو کی پیاس تر آب شور سے تری تلوار کی ہے دھار

قہرِ خدا ہے خود پہ دشمن کی تیری شمع ٹھیرے ہے کب وہ کرکے جگر گاہ سے گذار

یوں پشتِ زیں سے بہ کے نکل آئے زیرِ تنگ کہتے ہیں جوں عوام کہ صابن میں جیسے تار

تنہا نہ فرقِ مغفری اس پاس ہے کدو بازوئے جوشنی کو بھی سمجھے ہے ایک خار

زخمِ حمائلی سے گلے ہیں حریف کے زیرِ کمر ہے ...... جو اس نے ڈالا ہار

پھر کیونکہ اپنے خون میں کیا خاک سکا صید اک سانس لے سکا نہیں جسکا کبھی شمار

اگر حریف اس کا پیادہ تھا دو ہوا اور چار پارہ اس نے کیا تھا اگر سوار

ہے زیرِ ران تیرے جو وہ دیبے پر کمال کحل ضیائے چشمِ صباحیں کا ہے غبار

کہتا ہے یوں نسیم سے ہنگامِ جست خیز ٹھوکر سے .... مفلوج رعشہ دار

گا ہے سبک عنانی ہو دریا پہ جوں حباب وقتِ گراں رکابی ہو آتش میں جوں شرار

آہن سم ایسا سنگ کہ سطح بہ وقت جست — پر کار وار دم میں کرے دائرے ہزار
رنگ حنا میں خوے پے عرق یوں کفل پہ زیب — خوں کردہ جیسے عارض خوباں گل عذار
چھو جائے گر ہوا تک اس آتش مزاج کو — مشکل ہے پھر کہ لے کرۂ خاک پہ قرار
آباد اس کا خانہ زیں تجھ سے نت رہے — راکب کو ایسے چاہیے ایسا ہی راہوار
اے آبیار گلشن امید کامیاب — کھٹکے ہے دل میں نت ترے مداح کے یہ خار
تجھ سا سخن شناس ز سر تا بہ پا محک — مجھ سا سخن تراش ز پا تا بہ سر غبار
ناصر علی وقت کہوں گر میں آپ کو — اس کا مجھے بجان سخن گر ہو افتخار
کیونکر کہ اس کے زادۂ افکار کا جگر — اکثر گرفت اہل معانی سے ہے فگار
اور طبع زاد پر میرے گر سہو سے حسود — انگلی رکھے تو کاٹے بہ دندان انکسار
تیری جناب کو کہوں گر ذوالفقار خاں — ہر چند تھا وہ فخر امیران نامدار
ہر نکتہ دانیوں سے تری اے دقیقہ سنج — عشر عشیر رکھتا تھا کب خان ذوالفقار
اس پر کیا ہے اس نے جو ناصر علی کے ساتھ — حاجت نہیں بیان کی از افراط اشتہار
موقع تو ہے پڑھوں جو وہ مطلع حضور میں — جس پر ہوا وہ معدن ہمت ہے زر نثار
اے شان حیدری ز جبین تو آشکار — نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار
جز لفظ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات — ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
آئین قدر دانی میں لیکن برائے نام — لازم یہی ہے کر گیا جو خان باوقار
ناصر علی کہاں ہیں کدھر ذوالفقار خاں — رطب اللسان ہے آج ہی نظم آبدار
نقش حجر ہے صفحۂ عالم پہ ان کا نام — ہو جائیں گو کہ مضمحل اوراق روزگار
اے ذرہ ہا ز نام تو خورشید اعتبار — تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار

اس گفتگو سے مجھ کو اے ممدوح ذوالکرم — منظور عرض کرنا سخن کا ہے اقتدار

گر مدعا ہے اس سے تو حسن کلام ہے — حسن طلب کو دخل نہیں اس میں زینہار

کافر ہوں میں اگر میرے وہم و خیال میں — ایسی رکیک باتوں کا سہواً بھی ہو گزار

ملک وصلہ کے نام سے مجھ پر حرام ہے — لے ایک سے پچاس تک اور سو سے سو ہزار

کیونکہ کہ شاعری میری میراث کچھ نہیں — نے فخر میں سمجھتا ہوں اس کو نہ ننگ و عار

فن سپہ گری میں وہ ہے کسب کونسا — جو جانتا نہیں ہیں یہ تائید کردگار

پر اپنا ذکر اپنی زباں سے نہیں ہے خوب — کھل جائیگا وہ تجھ پہ کسی روز وقت کار

کل ہی کی بات ہے یہ مسافر وطن میں تھا — سو دو سوا ثنا کا حق بندگی گزار

شکر خدا کے آج بہ یک بینی و دو گوش — گرچہ دکن میں ہے نہیں ہر در پہ خوار و زار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکون — لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار

لابد ہے جبکہ جمع ہو خاطر بیان جو — طامع ہے در بدر جو پھرے پھر ذلیل و خوار

کنج خمول کو میں سمجھتا ہوں خانہ باغ — سیر بیاض شعر کو گلگشت سبزہ زار

کرتی جو کچھ کتاب ہے مجھ دل کیا ہے — یہ غم زدا شیاں نہ کرے یار غمگسار

تنہائی میں بھی خوش ہوں یہ ہیں قلندرانہ — یاران پوست پوش میں کے ہیں یا پیار

طول سخن گزر گیا حد ادب سے لے — اطول ہر [illegible] اب کروں جو طوالت میں اقتدار

اس سا مدعا شی سے مجھ کو جو ہی غرض — سو یہ ہے اے [illegible] قدر و کے تیار

سرکار سے تری جو زراہ تفضلات — ہے ڈیڑھ سو روپیہ [illegible] سے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے پر عرض کیا کروں — جس طرح اس میں [illegible] تا ہوں سیل اور نہار

بے گفتگو پچاس تو ان ڈیڑھ سو میں سے — ہوکر سوار جاتی یہ لے جاتے ہیں کہار

خلق خدا کا بار اٹھاتی ہے پالکی — میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار
باقی جو سو رہے کئی دن میں زباں پہ یہ — شل مجردات فقط ان کا ہے شمار
دے زار ایک بھی جو ہوں دشمن کے واسطے — بیزارجی سے ہوں تو ....
تجھ سا ہو قدر دان نکات اور نکتہ سنج — یوں ہو اسیر پنجۂ چرخ ستم شعار
فضل و ہنر جو مجھ میں ہو وہ سب پہ یکطرف — اور قدردانیاں بھی تری سب یہ یک کنار
آہن ہوں گر خشونت بخت سیاہ سے میں — کیدھر ہے یاد سے ترے کسریٰ کی یادگار
ہے ہمت بلند کا تیری جو اقتضا — اس امر میں تو ہے تجھے آئندہ اختیار
از بسکہ کم دماغ ہوں ضیق معاش سے — بالفعل تو اضافہ کا ہونگا امیدوار
لیکن نہ وہ اضافہ جو ہوے برائے نام — کافر ہوں سو بچاس میں گر ہو کچھ مدکار
تضعیف اصل چاہتا ہے تجھ سے یہ ضعیف — کیونکہ یہ بے حیائی نہیں ہوتی بار بار
غالب ہے تجھ پہ شائق نہ ہوں کیے تین سو — کچھ سو جب امیوں کو تو ہے بلکہ کچھ ہزار
یوں ہیں یقین کہ لوح جبین سوال کو — تزئین کرے ابھی ترا کلک قدر نگار
بس لطف اتنی بے ادبی تجھ سے ہے بعید — ہو ان نفس دراز یوں اپنی شرمسار
دے شاہد دعا کو بس اب جلوۂ فروغ — چشم قبول کب سے ہے مشغول انتظار
جب تک جہاں میں نام بہار و خزاں رہے — اور ابر تر ہو گلشن دنیا کا آبیار
باغ عمل عدو کا ترے نت رہے خزاں — اور گلشن امید ترا ہو سدا بہار

ارسطو جاہ بہادر ۱۷۹۷ء میں مدار المہام ہوئے اور ۱۸۰۴ء میں اس دنیائے فانی سے رحلت کر گئے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی جگہ نواب سر سالار جنگ اول کے جد امجد میر عالم بہادر کو قلمدان وزارت

سپرد کیا گیا۔ لطف نے اپنی شیوہ بیانی سے میر عالم بہادر کے ہاں بھی
باریابی حاصل کی۔ انہوں نے بھی بڑی قدردانی کی اور اپنی مصاحبت
میں رکھ لیا۔ لطف نے ان کی مدح میں بھی کئی قصیدے لکھے ہیں۔
میر عالم بہادر چار سال وزارت کر کے سنہ ۱۸۰۸ء میں انتقال کر گئے۔
اور ان کی جگہ ان کے داماد نواب منیر الملک دیوان ہوئے اور سنہ ۱۸۳۲ء تک
وزارت کے فرائض انجام دے کر وہ بھی راہی ملک عدم ہوئے۔ معلوم نہیں ہو سکا
کہ لطف ان کے ہاں بھی باریاب ہوئے تھے یا نہیں اور اگر ہوئے تو
انہوں نے ان کی کیا قدردانی کی۔ لطف کے موجودہ کلام میں کوئی
قصیدہ ان کی مدح میں نظر سے نہیں گزرا۔ غرض لطف نے دکن کو
اپنا وطن بنا لیا تھا۔ وہ اور ان کے عزیز و اقربا یہیں کے ہو گئے
تھے۔ چنانچہ صاحب گلزار آصفیہ کا جو ان کے معاصر اور آشنا تھے
بیان ہے کہ ان کے دو بھائی ایک مرزا علی رضا اور دوسرے حاجی
مرزا خان حیدر آباد میں تھے۔ اور شہر میں سوز خوانی کرتے تھے۔
ایک نے طبعی موت سے انتقال کیا اور دوسرے چوروں کے ہاتھ مارے
گئے۔ لطف نے سنہ ۱۲۳۸ھ م ۱۸۲۲ء میں وفات پائی اور حیدر آباد ہی میں
پیوند زمین ہوئے۔ گلزار آصفیہ اور محبوب الزمن کے مولف ان کی
خوش اخلاقی اور شیوہ بیانی میں رطب اللسان ہیں وہ لکھتے ہیں کہ
لطف خوش اخلاق پسندیدہ خصائل اور ظریف الطبع تھے۔ بذلہ سنجی
و لطیفہ گوئی میں بے نظیر تھے۔ اور محفل کی زیب زینت یاران ہم مشرب کو

آپ کی صحبت میں لطف وغیرہ آتا تھا۔ لطف گو دہلی میں پیدا ہوئے
تھے اور ان کی عمر کا ایک حصہ شمالی ہند میں بھی بسر ہوا تھا مگر ان کی
شاعری کا عروج دکن میں ہوا اور وہ بالآخر خود بھی اس دامنگیر سرزمین
میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ ایسے افراد جو اپنے مولد کو چھوڑ کر کسی دوسری
سرزمین پر آ بسیں اور اسی کے ہو رہیں وہ مستحق ہیں کہ اس ملک کے
افراد میں شمار کیے جائیں۔ توطن دائمی سے اس ملک کے ساتھ ان کو
جو ہمدردی و انس ہو جاتا ہے اس کے مدنظر وہ وہیں کے باشندے
قرار دیے جانے چاہئیں۔ لطف نے فورٹ ولیم کالج اور دکن سے
اپنے اس تعلق کو ایک شعر میں خوب ادا کیا ہے ؎

ہوا آوارہ ہندوستاں سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سازوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے

کلیات لطف

لطف کے کلام کے متعلق ان کے معاصرین اور مؤلف
محبوب الزمن کی رائے نہایت عمدہ ہے وہ ان کی شستگی و پختگی کلام
کے معترف اور شیرینی و رنگینی کے مداح ہیں۔ لطف نے غزل
قصیدہ اور مثنوی غرض جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے ان کا
کلیات افسوس ہے کہ لاپتہ ہے۔ مولوی غلام محمد صاحب وفا
مالک تاج پریس حیدرآباد کے ہاں "دیوان منتخب" کے نام سے
لطف کے کلیات کا نہایت ہی معتبر اور نفیس انتخاب قلمی نسخہ کی
صورت میں نظر آیا۔ موصوف کے نسخہ ہی سے ہم نے مندرجہ بالا

قصیدہ نقل کیا ہے اس کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔
"تذکرہ گلشن ہند" میں انہوں نے اپنے کلام کا ایک بہت بڑا حصہ نقل کر دیا ہے جو خود ان کا اپنا انتخاب کیا ہوا ہے اور ان کے کلام پر رائے زنی کرنے اور اس کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہے بعض متاخرین نے ان کے کلام کو سرے سے بے لطف بتایا ہے مگر یہ انصاف کا خون کرنا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا کلام ادبیات عالیہ اور درجۂ اول کا نہیں کہا جا سکتا تاہم اس میں ان کے اپنے دور کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ کلام میں ہمواری و روانی ضرور ہے ان کے قصیدے نہ صرف تاریخی حیثیت سے بلکہ خوبی سخن کے لحاظ سے بھی کچھ برے نہیں یہ سچ ہے کہ انہوں نے اعظم الامراء کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس میں ناصر علی کا ذکر کر کے تعلی کی ہے مگر یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اردو کے اکثر شعرا نے فارسی کے استادوں کے نام لے کر بڑی بڑی تعلیاں کی ہیں اور گو ان میں سے بعض واقعی قابل فخر تھے، مگر اکثر کی تعلیاں سراسر بیجا ہیں۔ ہم ان کے قصیدوں کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی غزلیں واقعی پھیکی ہیں۔ اور ان میں کوئی ایسی خاص خوبی بھی نہیں کہ ان کو بلند پایہ شاعر ثابت کر سکے مگر قصیدوں میں انہوں نے اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں اور طرزِ ادا صفائی و رنگینی کے اعتبار سے وہ اردو

کے اچھے قصیدہ گوؤں میں شمار ہونے کے مستحق ہیں۔ قصائد کا نمونہ اوپر آ چکا ہے۔ غزلیات میں سے ایک غزل مشتے نمونہ از خروارے یہاں درج کی جاتی ہے ؎

جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے — دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے

اللہ رے قید خانۂ ہستی کے دم کے ساتھ — ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے

رویا میں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار — تھے جائے گل درخت مغیلاں لگے ہوئے

بارے چھٹے اسیر بلا اس گلی میں آج — ہیں تودہ ہائے گنج شہیداں لگے ہوئے

بیمار کا تو تیرے کھلا حال بعد مرگ — سینہ میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے

رکھ سوچ کر قدم مری وادی میں گرد باد — پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے

کوئی تو میرے ناصح دانا سے یہ کہو — دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے

کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثل زلف — کانوں سے اسکے ہم سے پریشاں لگے ہوئے

گلشن ہند

لطف کا کلیات تو جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل نایاب ہے البتہ ان کا ایک کارنامہ ایسا ہے جس سے رہتی دنیا تک ان کا نام باقی رہنے کی توقع کی جا سکتی ہے اور یہ تذکرہ "گلشن ہند" ہے۔ یہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ترتیب دیا گیا ہے۔ لطف نے اپنے دیباچہ میں اپنی عادتی مسجع مرائی کے ساتھ بیان کو طوالت دیکر اس کی وجہ تالیف اور تاریخ لکھی ہے ہم اپنے مقصد کے لیے اس کا صرف ضروری حصہ نقل کر دیتے ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے اپنے تذکرہ شعرائے ہند کا

عبارت فارسی میں لکھا ہے اور نام اس کا گلزار ابراہیم رکھا ہے
سنہ ۱۱۹۸ھ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی
میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام
ہوا۔ رفتہ رفتہ جب .... مسٹر گل کرسٹ صاحب کی
نظر مبارک سے گزرا از بس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل
لکھا تھا۔ ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا
تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبان ریختہ میں کیا جائے تو خوب ہو
اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے تو نہایت
مرغوب ہو، مبتدی اس سے بڑا مزہ پائیں گے اور نو مشق کیفیت
بہت اٹھائینگے۔ چنانچہ اس خیرخواہ خفی و جلی میرزا علی کو
کہ لطف تخلص کرتا ہے نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ تو
تن دہی اس مقدمہ میں کرے تو ہم اس تذکرہ کو اپنی طرز پر لکھیں
اگرچہ یہ پابند الفت کا ان ایام میں ارادہ حیدرآباد کی سیر کا
رکھتا تھا لیکن اس خلق مجسم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ
کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا کہ مجھ سے سوائے
اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں
.... غرض مدعائے دلی اس صاحب عالی تدبیر کا
یہ معلوم ہوا کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد
ہمیں یہ ہے صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں ہم

ان کی تربیت کے لیے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں تا کہ ان کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے اور ان کی طبیعت بخوبی اس سے مزہ اٹھاوے تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے تو ایسا جن کو مبتدی دیکھ کر کہیں سبحان اللہ اور لفظ فارسی جگہ پاوے تو ایسا جس کو نوشق پڑھ کر کہیں واہ واہ...... الحمد اللہ آج کے دن کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی کے ہیں .... کہ موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے .... اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے "گلشن ہند" رکھا۔

دیباچہ کے آخر میں مزید احتیاط کی خاطر یہ قطعہ تاریخ بھی دیا ہے ؎

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے تو کیا پشت ہے
حیراں پھرے ہیں بے سر و پا بہمن اور دے — تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہے
(۱۲۱۵ھ) (۱۸۰۱ء)

لطف کا تذکرہ علی ابراہیم خاں کے تذکرہ گلزار ابراہیم کا سرسری ترجمہ نہیں بلکہ لطف نے اس تذکرہ کو پیش نظر رکھ کر اس کی بنیاد پر اپنے تذکرہ کی تدوین کی ہے۔ یہ ان کی مستقل تالیف ہے اور اس میں بہت سی باتیں اپنی چشم دید اور محققانہ طور پر لکھی ہیں۔ یہاں ہم مختصر طور پر علی ابراہیم خاں اور گلزار ابراہیم کا ضمناً تھوڑا سا حال لکھ دینا ضروری

سمجھتے ہیں۔

علی ابراہیم خاں صوبہ بہار کے ایک معزز رئیس اور نواب امین الدولہ نصیر جنگ کے خطاب سے مفتخر تھے۔ ان کا مولد و وطن عظیم آباد (پٹنہ) ہے وہ فارسی کے ایک کہنہ مشق شاعر اور بلند پایہ استاد تھے ان کے تبحر علمی اور مذاق شعر کا اندازہ ان کی تصنیفات سے بخوبی ہو سکتا ہے نام کی مناسبت سے خلیل تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے کوئی دس بارہ سال کی محنت سے سنہ ۱۱۹۸ھ میں تذکرہ گلزار ابراہیم مرتب کیا ان کی دوسری تصنیفات ہیں قابل ذکر (۱) خلاصۃ الکلام (۲) صحف ابراہیم (۳) وقایع جنگ مرہٹہ (۴) حالات سرکشی والی بنارس اور (۵) مجموعہ خطوط ہیں۔ پہلی دو کتابیں شعرائے فارسی کے مبسوط تذکرے ہیں تیسری کتاب وقایع جنگ مرہٹہ سنہ ۱۲۰۰ھ کی تالیف ہے اور اس میں سنہ ۱۱۷۴ھ سے لیکر سنہ ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں اور یہ مرہٹوں کے عروج و زوال کا صحیح مرقع ہے۔ پانی پت کی تیسری جنگ کا حال جس میں احمد شاہ درانی نے مرہٹوں کو نہایت زبردست اور حوصلہ شکن شکست دی تھی۔ ایک ایسے شخص سے لیکر بیان کیا ہے کہ جس نے اپنی آنکھوں یہ جنگ دیکھی تھی۔ چوتھی کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کی ایسٹ انڈیا کمپنی سے بغاوت کے حالات لکھے ہیں اور پانچویں ان کے خطوط کا مجموعہ ہے جو برٹش میوزیم میں محفوظ ہے اس سے اس زمانہ کے بعض حالات پر نہایت بصیرت افروز روشنی پڑتی ہے

لارڈ ہیسٹنگز گورنر جنرل نے ان کی عدالتی قابلیت کے مدنظر ان کو
بنارس کا صدر ناظم فوجداری مقرر کیا تھا اور اسی شہر میں ۱۸۱۲ء
میں وفات پائی۔ انہوں نے ہندوؤں میں مجرمین کی غیبی آزمائش
ٹرایل بائی آرڈی یل کے مروجہ طریقوں پر بھی ایک محققانہ رسالہ
سپرد قلم کیا تھا مگر ان سب تالیفات میں ان کا تذکرہ ان کی بہترین
یادگار اور اردو کے لحاظ سے بہت ہی قابل قدر چیز ہے اس میں تقریباً
تین سو شعرائے اردو کے مجمل حالات فارسی میں لکھے ہیں اور ان کے
کلام کے نمونے دیے ہیں۔ اس کو مصحفی اور شیفتہ وغیرہ کے تذکروں پر تقدم
کا فخر حاصل ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب نے اس کو
باہتمام انجمن ترقی اردو شائع کیا ہے ساتھ ہی گلشن ہند بھی شریک کر دیا ہے۔
لطف نے اس تذکرہ کی بنیاد پر اپنے تذکرہ کی عمارت کھڑی کی
ہے۔ "گلشن ہند" کی اصل میں دو جلدیں ہیں ایک مشاہیر شعرا کے متعلق
اور دوسری غیر معروف شعرا کے حال میں۔ خود مولف نے دیباچہ میں
اس کی صراحت اس طرح کی ہے "گلشن ہند کی دو جلدیں ہیں جلد اول
یہ جو تحریر کی جاتی ہے اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی اور
گوہر باریاں وزرائے والا تبار کی اور خوش استعدادیاں امرائے عالی مقدار
کی اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی جو کہ نام آور صاحب دیوان
تھے بیان کی گئی ہیں۔ جلد دوم میں مذکور کیے گئے ہیں شعرائے گمنام
وغیر مشہور یا نومشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ

اور گل و بلبل کی"۔

لطف کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری جلد بھی لکھی جا چکی ہے مگر یہ اب تک بالکل ناپید ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے کتبخانے اور ذخائر ادبیات مشرقیہ جہاں جلد اول کے قدیم نسخے موجود ہیں اس سے خالی ہیں کاش یہ جلد بھی پہلی جلد کی طرح کسی باخبر اور علم دوست شخص کے ہاتھ آجاتی اور وہ اس کو شایع کر کے اردو ادبیات میں ایک گراں قدر اضافہ کر دیتا۔

جلد اول جو اس وقت ہمارے پیش نظر اور عام طور پر شایع و رائج ہے (۶۹) شعرا کے احوال پر مشتمل ہے۔ غالباً اس کا اب تک ایک ہی ایڈیشن شایع ہوا ہے اور وہ مولوی عبداللہ خاں صاحب سابق منتظم کتب خانہ آصفیہ کا شایع کردہ ہے اس کی اشاعت کا قصہ بھی عجیب دلچسپ ہے۔ حیدرآباد میں ۱۹۰۸ء عیسوی کی بڑی طغیانی کے حادثہ قیامت نما کے تین چار سال قبل بھی رود موسیٰ میں طوفان ہوا تھا اس سیلاب میں کسی آفت زدہ کا کتب خانہ بھی برباد ہوا اس کی آب آوردہ کتابیں کوڑیوں کے مول بکنے لگیں ان میں سے یہ تذکرہ ایک صاحب غلام محمد مددگار مجلس کابینہ حیدرآباد کے ہاتھ لگا انہوں نے اس کو علامہ شبلی نعمانی کو دکھایا۔ علامہ موصوف

نے اس کی قدر و اہمیت کا اندازہ کر کے اس کو انجمن ترقی اردو کی شایع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا مگر انجمن تو اس کو شایع نہ کر سکی۔ البتہ ان کی تحریک سے عبداللہ خاں اس کی اشاعت پر مستعد ہو گئے اور نہایت اہتمام کے ساتھ علامہ شبلی کے تحشیہ و تصحیح اور مولوی عبدالحق صاحب کے ایک بسیط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں شایع کیا۔ مقدمہ میں مولوی عبدالحق صاحب نے فورٹ ولیم کالج کی خدمات اور کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈال کر اس تذکرہ کی خوبیاں گنائی ہیں یہ ایڈیشن ۱۲۳۵ھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے مرتب ہوا ہے۔ یورپ کے مشہور کتب خانوں میں "گلشن ہند" کے قلمی نسخے موجود ہیں ہم نے سنا ہے کہ نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں بھی تذکرہ گلشن ہند کے تین نسخے محفوظ ہیں ان میں سے ایک نہایت قدیم اور بسیط ہے۔ عبداللہ خاں کے مطبوعہ نسخے میں افسوس ہے کہ بعض بے جا تحریفیں ہوئی ہیں۔ کتاب کا حجم کم کرنے کے خیال سے لطف اور چند شاعروں کے نمونہ کلام کا بہت سا حصہ حذف کر دیا گیا۔

جہاں تک ہمیں اس وقت معلوم ہو سکا ہے شمالی ہند کے شعراء میں سب سے پہلے میر تقی میر نے شعرائے اردو کا تذکرہ لکھا ہے یہ ان کے قیام دہلی کی تالیف ہے۔ مگر اس کا سنہ تالیف کسی تذکرہ نویس بلکہ ناشر تذکرہ نے بھی نہیں لکھا مرزا اسود اسے

جو کچھ لکھا ہے غنیمت ہے۔ اُس زمانہ کے لوگ حالات زندگی بیان کرنے کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ لطف نے اکثر اساتذہ سخن کی آنکھیں دیکھی تھیں اور خود ان کا زمانہ بھی اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا اس لیے اکثر معاصرین اور اساتذہ کے متعلق اُن کے بیانات نہایت معتبر اور قابل سند ہیں اپنے پیش رو تذکرہ نویسوں کے برخلاف لطف نے بعض شعراء کے حالات میں جن کا تعلق تھوڑا بہت دربار سے بھی تھا، تاریخی واقعات بھی خوب لکھے ہیں۔ مثلاً شاہ عالم آفتاب۔ آصف الدولہ آصف اور امیر خاں عمدۃ الملک انجام کے ضمن میں تاریخی واقعات پر کافی روشنی ڈالی ہے اور اس زمانہ کی معاشرت اور سوسائٹی کا صداقت آمیز نقشہ کھینچا ہے۔ یہ بات اکثر تذکروں میں مفقود ہے۔ اور یہی گلشن ہند کی امتیازی شان ہے

اس تذکرہ میں بعض ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو ایک عرصہ تک بالکل نامعلوم تھیں۔ مگر اب اس کے علاوہ دیگر کتابوں کے ذریعہ عام ہو چکی ہیں۔ مثلاً میر حسن کی مثنوی گلزار ارم جس کا ذکر صرف مولانا آزاد نے کیا تھا اور ایک عرصہ تک مشتاق نگاہیں اسکی متلاشی تھیں، اس کے وہ اشعار جن میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی مذمت ہے اس تذکرہ میں موجود ہیں مگر اب یہ مثنوی مخزن مرحوم کے لایق مدیروں کی حسن سعی سے شایع ہو چکی ہے۔

اسی طرح میر اثر کی مثنوی خواب وخیال جس کی ایک زمانہ سے صرف
تعریف ہی تعریف سنتے آئے تھے اس کا بھی ایک حصہ اس میں
دیا ہوا ہے مگر حال ہی میں اصل مثنوی انجمن ترقی اُردو کی جانب
سے شایع ہوگئی ہے ۔ قدیم شعرائے دکن میں مؤلف نے ابوالحسن تاناشاہ
(۱۰۸۳ھ تا ۱۰۹۸ھ) کو بھی شاعر بتایا ہے اور علی ابراہیم خاں کے
حوالہ سے یہ شعر اُن کی طرف منسوب کیا ہے ؎

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بچھڑا ہے
ایک بات کسے ہونگے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

"جی بارہ باٹ ہونا" دکن کا ایک قدیم محاورہ ہے اور کچھ عجب
نہیں کہ یہ شعر انہیں کا ہو۔ کیونکہ لچھمی نارائن شفیق اور دیگر دکھنی
تذکرہ نویسوں نے بھی یہ شعر انہیں سے منسوب کیا ہے۔

لطف نے بعض موقعوں پر نہایت سفید جھوٹ لکھا ہے
تاناشاہ کے ذکر میں مکہ مسجد حیدرآباد کی بیخ کنی کا الزام اورنگ زیب
عالمگیر پر نہایت دریدہ دہنی سے لگایا ہے اور لکھتے ہیں "خلد مکان
نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا اور مکہ مسجد
کھدوا کے جو کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت سے
کیا مفاد ہے"۔ یہ عالمگیر پر نرا بہتان ہے اسی طرح انہوں نے
اپنی تنگ نظری اور تعصب بیجا سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب
اور اُن کے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی ہجو ملیح کی ہے اور

اول الذکر پر مناقب معاویہ وابطال شہادت حسینؓ میں ایک کتاب لکھنے کی تہمت باندھی ہے یہ بات تذکرہ نویس کی شان کے منافی اور نہایت معیوب حرکت ہے ہم کو لطف کے معتقدات اور تعصب پر اس وقت کچھ لکھنا مقصود نہیں۔ صرف یہ کہدینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کے بعض بیانات میں صداقت بھی ہے اور بعض میں کذب و افترا بھی۔

مرزا علی لطف کی زبان گنجلک اور تعقید سے معمور ہے وہ قافیہ پیمائی کے اس قدر عادی ہیں کہ گویا سیدھی عبارت لکھنا ہی نہیں جانتے جو عبارت لکھی ہے مقفٰے و مسجع جو بات بیان کی ہے تشبیہ و استعارہ کے انداز میں۔ باوجودیکہ یہ تذکرہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے لکھا گیا ہے اور خود اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ان کتابوں کے لکھوانے کا مقصد ولایت کے "تازہ وارد انگریزوں کو اردو سکھانا اور آسان طرز بیان کی کتابوں کا ذخیرہ بڑھانا ہے" مگر وہ اپنا مخصوص انداز بیان نہ چھوڑ سکے اور فارسی عربی الفاظ کے بکثرت استعمال سے کتاب جدید کے لیے عسیر الفہم بنا دیا ہے۔ لطف گو دہلی کے باشندے تھے اور وہیں تربیت پائی ہے مگر ان پر عربی فارسی کا رنگ بے حد غالب ہے وہ محاورے اور روزمرے کے استعمال پر تشبیہ و استعارہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی زبان بہت قدیم ہے اور میر و سودا کے کلام میں جو قدیم الفاظ موجود ہیں اور جن کو اب بالکل ترک کر دیا گیا ہے ان کی زبان پر چڑھے ہوئے ہیں۔ اور بڑی

بے تکلفی سے ان کو استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نثر میں جابجا
اس کی مثالیں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں "شورش
تخلص متوطن عظیم آباد کے مشہور میر بیٹا کر کے تھے" میر و سودا کے کلام میں
میں کہا بجائے میں نے کہا کے اکثر جگہ پایا جاتا ہے۔ دکن میں بھی ایک
زمانہ تک اسی طرح کہتے تھے۔ بعض موقعوں پر فعل متعدی میں فعل کو
بجائے مفعول کے فاعل کے لحاظ سے لکھا ہے جیسے "دلی سے جبکہ لکھنؤ میں
آئے تو طور سکونت کا ٹھیرائے" غرض ان کی زبان میں ایسے بہت سے
متروکات پائے جاتے ہیں جو قدما کے کلام کی یادگار ہیں۔ فورٹ ولیم کالج
کے مولفین میں ایک مولوی امانت اللہ کی زبان پر عربیت کا رنگ اس قدر
غالب ہے کہ صاف اور شستہ عبارت اُن سے سرانجام نہیں ہوسکتی اور
دوسرے مرزا علی لطف کہ سیدھی سادی اُردو لکھنا عیب سمجھتے اور بے وقت
رنگینی کے ساتھ مقفّٰی و مسجع عبارت کا التزام رکھتے ہیں ان دونوں
کے سوا اس کالج کے تمام مولفین صاف اُردو نویسی میں مشاق اور
ممتاز ہیں زبان اور طرزِ بیان کے لحاظ سے تذکرہ گلشن ہند ایسی چیز
نہیں کہ اس کو مقبولیت عام حاصل ہوسکے یہ محض ایک تاریخی کتاب
اور شعرائے اُردو کے حالات میں ایک گراں قدر تذکرہ ہونے کی وجہ سے
اُردو ادبیات میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اگر
لطف اس زبان میں کوئی قصہ لکھتے یا کسی کتاب کا ترجمہ کرتے تو
یقیناً طاق نسیاں کی نذر ہوجاتا اور اس کو ہرگز مقبولیت نصیب نہ ہوتی۔

نمونتاً قایم چاندپوری کے حالات جو بہت ہی مختصر طور پر بیان کیے گئے ہیں نقل
کیے جاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مولف نے سیدھی سادھی باتوں کو کس پیرایہ اور کس
التزام کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"قایم تخلص شیخ محمد قایم نام متوطن چاندپور ندینہ (غالباً یہ نگینہ ہوگا)
کے نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا
کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف کہتے ہیں کہ
ابتدائے مشق میں مشورہ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا
اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا
سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں
یہ اسلوب ہے۔ راقم آثم کو تو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے
نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اس شیریں مقال
کے اور خامہ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اس نازک خیال کے
صفائے بندش سے اس کی آئینہ کو طلب صفائی دوام اور خجالت سے
اس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اس نظم
صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی اور موج زنی اس طبع
معانی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص
کا اس جہان فانی سے اٹھ جانا اور داغ حسرت سے دلوں کو
ارباب فہم کے جلانا۔ اس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید
سنہ ۱۲۱۰ھ میں ادھر ہی نواح وطن میں اپنے اس دار فانی سے

سیر عالم باقی کی کی ۔ اور عجب طرح کی ایذا جان اہل معانی کے
دی ۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی قسم اس شیریں کلام سے نہیں
رہی ہے لیکن رغبت طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی
بیشتر کہی ہے ۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے
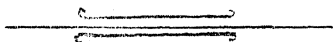
مولوی امانت اللہ

مولوی امانت اللہ فارسی اور عربی کے ایک جید عالم تھے۔ یہ بھی فورٹ ولیم کالج میں ملازم اور عربی فارسی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مامور تھے ان کے حالات زندگی اور تاریخ پیدایش و وفات وغیرہ باوجود کوشش کے حاصل نہ ہوسکے کسی صاحب تذکرہ نے ان کا ذکر نہیں کیا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ ان کا وطن کونسا شہر تھا اور وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ ان کی کتاب کی زبان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمالی ہند کے باشندے تھے اور غالباً صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے کسی شہر میں رہتے تھے ان کی کتاب "جامع الاخلاق" اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ مگر وہ بھی اُن کے حالات پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہے اس کے دیباچہ میں ایک ذیلی عنوان "کتاب کے ترجمہ اور مصنف کے احوال کا بیان" موجود ہے مگر اس میں بھی انہوں نے صرف اپنا نام لکھ کر یہ بتایا ہے کہ جامع الاخلاق کس کے ایما سے لکھی گئی اور اور اس کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ افسوس ہے کہ ایسے باکمال شخص کے ذکر سے ہمارا سارا تذکرہ و تاریخ خالی ہے اور اب تک کسی مصنف نے ان کا حال بیان نہیں کیا۔

اس وقت ان کے متعلق جو کچھ بھی معلومات ہو سکتی ہے وہ صرف انہی کی کتابوں کے متفرق بیانوں سے اخذ کی جا سکتی ہے مگر ان کی مولفات بھی اسی طرح حالات پر روشنی نہیں ڈال سکتیں جس سے مجبوراً حالات زندگی سے قطع نظر کرنی پڑتی ہے۔ مولوی امانت اللہ کی حسب ذیل (۵) کتابیں ہیں

(۱) ہدایت الاسلام عربی (۲) ہدایت الاسلام اُردو (۳) جامع الاخلاق (۴) صرف اُردو منظوم (۵) ترجمہ قرآن مجید۔ ان میں سے اول الذکر دو کتابیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے مذہب اسلام سے متعلق ہیں اور ان میں اسلام کے ارکان اور معتقدات کا تفصیل وار ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتابیں انکی پہلی تالیفات ہیں اور جامع الاخلاق کے ایک بیان سے بھی جس کو ہم آگے نقل کرنا چاہتے ہیں ان کتابوں کا سب سے پہلے تالیف ہونا ثابت ہے مولوی امانت اللہ نے تکمیل علوم کے بعد سب سے پہلے اپنے مبلغ علم سے کام لیکر عربی میں ہدایت الاسلام تالیف کی۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے اور اصل کی دو جلدیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کتاب سے عامتہ المسلمین جو عربی سے نابلد تھے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے اور اس کا استفادہ صرف خواص تک محدود تھا۔ علاوہ ازیں اس زمانہ میں فورٹ ولیم کالج قایم ہو چکا تھا اور وہاں اردو نثر نویسوں کی خوب قدر و منزلت کی جا رہی تھی۔ اس خیال نے مولوی امانت اللہ کو بھی اُردو نثر نویسی کی طرف متوجہ کیا اور انہوں نے بجائے کسی اور کتاب کا ترجمہ کرنے یا کوئی دوسری تالیف مرتب کرنے کے اپنی ہی عربی کتاب کو اردو میں لکھنا شروع کیا۔ اس سے ایک طرف ان کی عربی کتاب کے استفادہ کا دائرہ وسیع ہو گیا تو دوسری طرف انھوں نے اپنی اردو نثر نویسی کا ایک نمونہ بھی مرتب کر لیا۔ جب اردو ہدایت الاسلام کی پہلی جلد تیار ہو گئی تو اس کو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا اس کے مطالعہ سے ڈاکٹر گل کرسٹ پر ان کے تبحر علمی کا سکہ بیٹھ گیا۔

اور وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو خاص عربی اور فارسی کی ادق کتابوں کے ترجمہ کے لیے کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم رکھ لیا۔

ہدایت الاسلام ۱۸۰۴ء میں ڈاکٹر گل کرسٹ کی حسن سعی سے ہدیت الاسلام کی جلد اول کالج کی جانب سے شایع ہوئی اور خود انھوں نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ہدایت الاسلام کا یہی ایک ایڈیشن نکلا تھا بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں یہ نسخہ محفوظ ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو۔

> فصل کعبے کے درمیان نماز پڑھنے میں:۔ فرض کی یا نفل کی نماز کعبے کے اندر صحیح ہے اگرچہ مقتدی کا مُنہ امام کے منہ کی طرف ہو اور جو مقتدی کی پیٹھ اس کے مُنہ کی طرف ہو تو نماز اسکی صحیح نہیں ہوتی ہے اور کعبہ کے اوپر مکروہ ہے اور کعبہ کے چاروں طرف اقتدا کرنا گو بعضے مقتدی امام کی نسبت سے اسکی طرف نزدیک ہو صحیح ہے۔ پر امام جس جانب میں ہے اگر مقتدی اسی طرف کو امام کی نسبت سے کعبہ کی طرف نزدیک ہو تو اس کی نماز درست نہیں کیونکہ اس تقدیر میں وہ امام کے آگے ہو جائیگا اور مقتدی کو اس کے آگے کھڑا ہونا درست نہیں ہے۔" ہدیت الاسلام ص ۹۳

ترجمہ قرآن شریف کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم ہو کر مولوی امانت اللہ نے ہدیت الاسلام کی دوسری جلد کا ترجمہ تمام کیا اور پھر ڈاکٹر گل کرسٹ کے حکم سے میر بہادر علی حسینی کے ساتھ قرآن شریف کا اُردو ترجمہ کرنے لگے۔ مگر ابھی اس کام کو شروع

کیے ہوئے چند ہی روز گذرے تھے کہ ۱۸۰۴ء کے اواخر ایام میں ڈاکٹر گل کرسٹ
خرابی صحت کی وجہ سے وظیفۂ حسن خدمت پر کالج سے سبکدوش ہو گئے
اور انہیں مولوی امانت اللہ کی سرپرستی کرنے اور ان سے کوئی مفید
تالیف یا ترجمہ کرانے کا خاطر خواہ موقع نہ ملا۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کی علحدگی
کے بعد ہی ان کے جانشینوں نے قرآن شریف کے ترجمہ کے کام کو
موقوف کرا دیا اور اس طرح یہ مفید کام ادھورا رہا۔ قرآن شریف کے
ترجمہ کے لیے ابتداءً یہی دو صاحب مقرر ہوئے تھے مگر اس کے بعد انکی
امداد کے لیے کالج کے بعض اور مولوی بھی اس کام پر مامور کیے گئے۔
گل کرسٹ کے جانشینوں نے ترجمہ شدہ حصہ کو بھی کالج کی طرف سے
شائع کرانا پسند نہ کیا اور کالج کی مطبوعات اس سے خالی ہیں۔ حسن اتفاق
سے مولوی امانت اللہ کے ترجمہ کو جو سورۂ فیل سے آخر قرآن مجید تک ہے
اشاعت کا موقع مل گیا اور بمبئی کے ایک قدیم کتب خانہ میں اس کا
ایک مطبوعہ نسخہ ملا ہم نے اس کا اقتباس حاصل کر لیا ہے جو ذیل
میں درج کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود انہوں نے یا کسی اور شخص
نے جس کو کالج سے کچھ تعلق نہ تھا اس کو شائع کیا ہے۔

اور نہیں کوئی چلنے پھرنے والا مگر زمین میں مگر خدا ہی پر ہے اسکی
روزی اور جانتا ہے وہ اس کے ٹھیراؤ کو اور اس کے سونپے
جانے کی جگہ کو سب کچھ روشن کتاب میں ہے اور وہی تو

وہ خدا ہے جس نے بناڈالا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں،
اور اس کا عرش پانی پر تھا تا کہ آزمائے ہمیں کہ کون ہے تم میں
سے بہتر چال چلن کی راہ سے اور اگر کہتا ہے تو کہ ضرور تم اٹھائے
جاؤگے مرنے کے بعد تو کہنے لگتے ہیں وہ لوگ کہ جو کافر ہو گئے، کہ
نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ اور اگر دیر لگا دیں ہم ان کے
عذاب میں گنتی کے کچھ زمانوں تک کہنے لگے ہیں کہ کس نے
روک رکھا اُسے۔ آگاہ ہو کہ جس دن آپڑے گا وہ اُن پر
تو نہ ہٹایا جائیگا اُن سے اور گھیر لیگا انہیں وہی عذاب
کہ جس پر ہمیشہ وہ ٹھٹے لگایا کرتے تھے اور چسکا لگا دیتے ہیں
ہم آدمی کو اپنی رحمت کا۔ پھر چھین لیتے ہیں اس سے تو ضرور
وہ .... اور بڑا ناشکر ہو جاتا ہے۔ اور اگر
چکھا دیتے ہیں ہم ان کو نعمتیں ضرروں کے بعد وہ ضرر کہ چھو
جاتے ہیں اسے تو کہنے لگتا ہے کہ گئے گذرے ہوئیں سب برائیاں
مجھ سے اور ضرور وہ بہت مگن اور بڑا ..... ہونا ہے مگر وہی لوگ کہ جو
جھیل جاتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں جو بھلے کام تو انہیں کے لیے تو بخشش
ہے اور بہت کھری مزدوری۔" (ترجمہ قرآن مجید ص ۲۶۹)

جامع الاخلاق

قرآن شریف کے ترجمہ کو موقوف کرکے کپتان جیمس مونٹ نے جٹاگلر گلکرسٹ کی جگہ
اُردو کے پروفیسر مقرر ہوئے تھے مولوی امانت اللہ سے فارسی کی مشہور

اور معرکۃ الآرا کتاب اخلاق جلالی کو جس کا اصلی نام "لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق" ہے اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمایش کی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں کتاب کے ترجمہ اور مصنف کے احوال کا بیان' کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں۔

"یہ دولت خواہ سرکار فیض آثار کمپنی بہادر دام اقبالہٗ شیخ امانت اللہ مترجم تفرقہ ہندی مدرسہ کا ہے' جب اس بندے نے نسخہ ہدایت الاسلام سے فراغت کی اور صاحب ممدوح (یعنے کپتان جیمس مونٹ) کی خدمت میں اظہار کیا ارشاد ہوا کہ تو اخلاق جلالی کا ترجمہ زبان ریختہ میں کر۔ اگرچہ یہ کتاب بغایت مغلق اور دقیق المضمون اول سے آخر تک تمام مسائل حکمی اور تدقیقات علمی سے مشحون ہے اور ترجمہ کرنا اس کا مستلزم تجربہ مادۂ جسمانی اور اسقاط قوائے انسانی کا ہے۔ لیکن بمقتضائے نمکخواری کے صورت انکار کی مناسب نہ دیکھی اور فضال حقیقی پر توکل کر کے اس میں اقدام کیا لیکن اس کے خطبہ کے بدلے دوسرا خطبہ علیحدہ کہہ کر ضمیمہ اس ترجمہ کا کر کے حکمت علمی کی تقسیم سے شروع کیا اور حتی المقدور اس کی تسہیل کرنے میں کوتاہی نہیں کی۔ مگر ان اصطلاحوں کا جن کا ترجمہ اس زبان میں ممکن نہیں انشاء اللہ تعالیٰ بعد اتمام کے ان اصطلاحوں کی تفسیر اشارے و کنائے سے کر کے جدی ایک فرہنگ مختصر تخمیناً مقدار دو تین جزو کے آخر کتاب میں ملحق کی جائے گی جس کسی کو کسی لفظ میں شبہ ہو تو اس فرہنگ میں دیکھ لیوے اور جابجا کمی زیادتی کر کے ترجمہ لفظی چھوڑ سہل ہونے

کے لیے مطلب بیان کر دیا ہے۔ پر ترتیب اس ترجمہ کی بہ اعتبار ابواب
وفصول کے مطابق اصل کتاب کے باقی رہی نام اس کا جامع الاخلاق رکھا"
جامع الاخلاق کی ترتیب ۱۸۰۵ء کے وسط میں ختم ہوئی۔
خاتمۃ الکتاب میں اس کی تاریخ اختتام ترجمہ کی مشکلات اور اپنی
محنت شاقہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" جولائی کی بیسویں دوشنبہ کے دن ۱۸۰۵ء م ۱۲۲۰ھ کو بہت محنت
وجانفشانی اور فضل یزدانی کی مدد اور صاحبان عالیشان کے اقبال کی
برکت سے اس ہیچمدان نے کتاب لوامع الاشراق فی مکارم الاخلاق
عرف اخلاق جلالی کے ترجمہ سے فراغت کی ولیکن داناؤں کے نزدیک
پوشیدہ نہ رہے کہ اس کے لالی مطالب کو جو عبارت فارسی کے صدف
میں پنہاں تھے غواص طبیعت نے دریائے فکر میں کس کس طرح سے
غوطے مار کر نکالا اور ان آبدار موتیوں کو رشتۂ تحریر میں پرو کر ریختہ
زبان کے اردو بازار میں لا حاضر کیا"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

" جاننا چاہیے کہ ترجمہ سے فراغت کرنے کے بعد بعضے دوستوں نے
تکلیف دی کہ تاریخ اتمام کی اگر اس میں منظم ہو تو بطور یادگار کے رہے میں نے
بھی اس کو مناسب جان کر تاریخ ہجریہ میں یہ قطعہ کہکر یہاں لکھدیا۔

ترجمہ سے جب ہوا فارغ — فکر تاریخ طبع پر تھی شاق
ذوق تیغ علم سے سر جہل — بولا ہاتف " تماہی اخلاق"
۱۲ ۲۰ ھ

جامع الاخلاق ہی مولوی امانت اللہ کا وہ واحد کارنامہ ہے جسکی بدولت ان کا نام اردو ادبیات میں باقی ہے۔ اخلاق جلالی سی اہم اور ادق کتاب کا ترجمہ کرنا کچھ آسان کام نہ تھا اور مولوی امانت اللہ نے اس کو محنت سے انجام دے کر اردو کے ادیبوں میں ایک ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ اس کی تکمیل کے بعد اس کو فورٹ ولیم کالج کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں داخل کر لیا گیا اور اس ضرورت سے اس کے دو تین ایڈیشن شایع ہوئے مگر یہ کتاب کچھ بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئی اس کا سبب اول تو یہ ہے کہ اس کا موضوع نہایت خشک اور ادق ہے ہر کس و ناکس اس کے سمجھنے اور اس کے مطالب عالیہ تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھ سکتا۔ اس کے علاوہ مصنف نے اخلاقیات پر جو فلسفیانہ نظر ڈالی ہے اس نے اس کتاب کو اور بھی مشکل بنا دیا۔ اور یہ خالص علمی کتاب ہو گئی۔ عوام اس سے کسی طرح خاطر خواہ دلچسپی نہیں لے سکتے تھے البتہ خواص کی توجہ کے لائق تھی اور ہے۔ وہی اس کے مطالب پر عبور حاصل کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مولوی امانت اللہ نے اگرچہ مضمون کو سہل بنانے اور آسان کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اپنی کوشش میں پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔ اول تو ان کی زبان مولویانہ ہے۔ عربیت کا اس قدر غلبہ ہے کہ سیدھی سادھی عبارت نہیں لکھ سکتے پھر اس پر اخلاق جلالی کا طرز بیان بھی جیسا کچھ ادق ہے مشہور ہے۔ انہوں نے اپنے ترجمہ میں اصل فارسی کے موٹے موٹے الفاظ و لغات کو بہت بڑی حد تک باقی رکھا اور اسی کو

انشاء پردازی کا جوہر سمجھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبارت میں تعقید اور گنجلک پیدا
ہو گئی اور جملے طولانی ہو گئے۔ فورٹ ولیم کالج کے جتنے بھی اہل قلم تھے ان سب
کی زبان ان کے مقابلہ میں سلیس اور صاف ہے اگرچہ ان کے بیان سے
معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ترجمہ میں آزادی سے کام لیا ہے مگر ہمارا
خیال ہے کہ اکثر و بیشتر موقعوں پر اصل فارسی طرز بیان کی کورانہ تقلید کی
ہے اور عبارتوں کو اسی ترکیب کے ساتھ اردو میں منتقل کر لیا جس کی
وجہ سے ساری کتاب تعقید سے مملو ہو گئی ہے اور عام فہم نہ رہ سکی۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ اخلاق جلالی کا ترجمہ اس قدر آسان اور صفائی
کے ساتھ ممکن نہیں جس طرح اخلاق محسنی یا گلستان کا ہو سکتا ہے مگر
مولوی امانت اللہ کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا کہ وہ اس ادق کتاب کو
جب اردو کے قالب میں ڈھال رہے تھے تو اتنی سلیس اور عام فہم بناتے کہ
خاص و عام سب اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مضمون
کی سنجیدگی کو نظر انداز کر دیا جائے بلکہ سنجیدگی مضمون کے ساتھ اگر سلاست
بیان اور زبان کی روانی کو ملحوظ رکھا جاتا تو یہ مقصد بخوبی حاصل ہو سکتا
تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے عالم متبحر تھے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر
علوم قدیمہ اور زبان عربی کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ وہ ٹکسالی زبان
نہیں لکھ سکتے تھے ان کے دیباچہ کا بھی یہی حال ہے اس میں بھی فارسی کا
بیحد تتبع کیا گیا ہے اور معمولی بات کو بڑے بڑے لغات کے ذریعہ بیان
کیا گیا ہے۔ انہوں نے دیباچہ میں جس فرہنگ اصطلاحات کا ذکر کیا ہے وہ کتاب کے

ساتھ ملحق نہیں ہے اور اس وقت تک جامع الاخلاق کے جتنے بھی مطبوعہ نسخے دیکھے گئے وہ سب اس فرہنگ سے خالی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ خود کسی اتفاقی وجہ سے اس کا تکملہ نہ کر سکے ۔ ورنہ قرین قیاس نہیں کہ کتاب شایع کرنے والے اس مطلوبہ اضافہ کو قدر کی نگاہ سے نہ دیکھیں اور اس گنجینۂ معلومات سے ناظرین کتاب کو محروم رکھیں ۔

جامع الاخلاق کے آخر میں ایک مختصر سی مثنوی دی ہوئی ہے اور متن کتاب میں بھی جابجا ضرورت سے فارسی اشعار کو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے ۔ نیز ان کا رسالہ صرف اردو تو بالکل منظوم ہی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولوی امانت اللہ شاعر بھی تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے مگر ان کی شاعری کا پایہ کچھ بلند نہ تھا اور اس وجہ سے کسی تذکرہ نویس نے ان کو قابل ذکر نہیں سمجھا ۔ طبقات شعرائے ہند میں بھی جس میں خصوصیت کے ساتھ انیسویں صدی عیسوی کے اکثر و بیشتر شعرا کا حال لکھا گیا ہے ان کا ذکر نہیں ہے ان کی شاعری بالکل سادہ، علمی، اخلاقی اور پند آموز تھی ان کے اشعار میں شوخی اور زور مطلق نہیں وہ پیشہ ور نغز گو اور سخن طراز نہیں تھے بلکہ تفنن طبع کے طور پر اور کبھی کسی خاص ضرورت پر شعر موزوں کر لیا کرتے تھے شاعری انکا پیشہ نہ تھی اور نہ وہ اس کو اپنا کمال سمجھتے تھے ۔ وہ ایک سرکاری درسگاہ کے ذمہ دار مدرس اور عالم تھے اور فی نفسہ شاعری سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا ۔ ذیل میں ان کی مثنوی اور چند شعری ترجمے مع اصل کے نقل کیے جاتے ہیں ۔ متفرق اشعار سے ظاہر ہوتا ہے

کہ انہوں نے بلا کدو کاوش اظہار کمال کر دیا ہے اور جہاں گنجایش پائی ہے رنگینی و گل افشانی کی بھی کوشش کی ہے۔

مثنوی

علم حکمت سے جو کہ ہو آگاہ — اور عامل ہو اس کا خاطر خواہ
ہووے تدبیر اس کی محکم تر — رہے آرام سے وہ شام و سحر
ہر دو عالم میں بہرہ ور ہووے — مالک ملک سیم و زر ہووے
زندگانی کے حظ سے عاطل ہو — علم حکمت سے جو کہ جاہل ہو
یہ نصیحت تو یاد رکھ میری — دوست رکھ جاں سے حکمت عملی
ہے وہ بنیاد بادشاہت کی — اصل مضبوط ہے سیاست کی
یہ سخن ہے پسند ہر دل کو — کب ہے شاہی درست جاہل کو
اپنی اوقات کو تو ضایع نہ کر — روز و شب رہ پہ کسب علم و ہنر
عمل و علم اور درستیٔ رائے — ہیں معاون ترے پہ فضل خدائے
جز ہنر کوئی تیرا یار نہیں — بے ہنر کا کہیں وقار نہیں
خاتمہ اس سخن پہ کر شیدا — صلح کل پر ہے راحت دنیا

متفرق اشعار

ترجمہ — اصل

بل بے اے عشق کہن سال! تو ہر دم نو ہے — یلہ اے عشق کہن سال! تو ہر روز نوی

تیرے فرمان کے تابع ہے ہر اک پیر و جواں — زیر فرمان تو ہر جا کہ ضعیف است و قوی

مغرور مت ہو ہرگز مال و جمال سے ہاں — بر مال و جمال خویشتن غرہ مشو

اک شب میں اس کو لے لیں اور اسکو اک تپ میں — کان را بہ شبے برند و این را بہ تبے

سکنجبین نے قضا را بڑھایا صفرا کر — از قضا سرکنگبین صفرا فزود

عجب کہ روغن بادام سے ہو خشک دماغ — روغن بادام خشکی می فزود

مرتا ہے کب وہ جو کہ ہوا زندہ عشق سے — ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثابت ہے جاودانی ہماری کتاب میں — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

خوب دن وہ ہے کہ اس منزل ویران سے چھوٹوں — خرم آن روز کزین منزل ویران بروم

ساتھ جاناں کے چلوں راحت جانی پاؤں — راحت جان طلبم وز پے جانان بروم

ذرہ سا رقص کناں راہ طلبگاری میں — بہ ہوائے رخ او ذرہ صفت رقص کناں

پہنچوں مطلب کو گر اس چشمۂ خور تک پہنچوں — تا لب چشمۂ خورشید درخشان بروم

اے دوست اگر گزر ہوے عدو کے جنازہ پر — اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری

شاداں نہ ہو کہ تجھ پہ بھی گذرے یہ ماجرا — شادی مکن کہ بر تو ہمین ماجرا رود

غبار تن کا مرے ہے حجاب چہرۂ جاں — حجاب چہرۂ جاں می شود غبار تنم

۸ خدا کرے کہ میں اس چہرہ سے نقاب اٹھاؤں — خوشا دمے کہ ازین چہرہ پردہ برفگنم

نہ یہ قفس ہے سزاوار مجھ خوش الحاں کے — چنین قفس نہ سزائے من خوش الحان است

عدم کا طائر قدسی ہوں اس چمن میں جاؤں — روم بہ گلشن رضوان کہ مرغ آن چمنم

۱۰ - ع - اس سے بہتر اور کیا ارشاد ہے — ع - ازین خوشتر چہ باشد حسن ارشاد

جامع الاخلاق کا ایک ایڈیشن ۱۸۴۸ء میں منشی غلام حیدر نے

مطبع احمدی کلکتہ سے شایع کیا تھا یہ سب سے قدیم ایڈیشن ہے اور آج
کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کتب خانہ
آصفیہ حیدر آباد میں ایک ایک نسخہ ہے اور معارف جلد ۱۱ نمبر ۲ کے دیکھنے
سے معلوم ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود صاحب ساکن عظیم آباد کے ہاں بھی
ایک نسخہ اس سنہ کا طبع شدہ ہے یہ نسخہ ٹائپ کے حروف میں ہے اور
اس کی ایک کاپی اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ ذیل میں اس سے
ایک چھوٹا سا اور کسی قدر سلیس بیان نقل کیا جاتا ہے اس سے مولوی
امانت اللہ کے طرز بیان کی خصوصیات کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔

تنویر۔ حکیم ارسطاطالیس نے کہا ہے عدالت فضیلت کے جزو کے
برابر ہی بلکہ وہ تمام فضیلت ہے اور ظلم جو مقابل اس کے ہے رذیلت کے
جز کے مطابق ہے بلکہ وہ سرتاپا رذیلت ہے لیکن عدالت پہلے شخص
اور اس کے خصایل سے علاقہ رکھتی ہے جیسے اس کی طرف اشارہ
ہوا ہے پھر اس کے شریکوں کے ساتھ اہل خانہ یا شہر کے رشتہ داروں
میں سے ہوں۔ اس واسطے پیغمبر خدا علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ہے
کہ ہر ایک تم میں سے اپنے اعضائے جسمانی اور قوائے نفسانی کا
نگہبان ہے وہ قیامت میں پوچھا جائیگا۔ ان کے احوال سے اور
جب فرمایا کہ عادل لوگ منبر کے اوپر حق سبحانہ تعالیٰ کے نور کے
مثال ہیں صحابیوں نے پوچھا وے کون آدمی ہیں فرمایا وے جو پہلے
اپنے حق میں اور اپنی اولاد کے حق میں عدالت کریں۔ پھر ان کے

حق میں جو انکے ملک عدالتکے تابع فرمان ہیں حکیموں نے بطور تمثیل کے کہا
ہے جو چراغ کہ اپنے پاس ہے۔ اگر اُسے روشن نہیں رکھ سکتا ہی
پس جو کہ اس سے تفاوت ہے بطریق اولے اس کو روشن نہیں رکھیگا
یعنے جو کوئی اپنی اور اپنے خصائل اور اعضا کی عدالت سی عاجز ہے
پھر اس سے اہل خانہ اور شہریوں کی عدالت متصور نہیں ہے۔ چاہئیے
کہ اپنے تن بدن کی عدالت سے خبردار ہو اور افراط و تفریط کی مضرت
سے احتراز کرے بعد اس کے گھر کے لوگوں یا شہر کے رہنے والوں سے
وہی طریق مسلوک رکھے اور نائب خداوند تعالٰی کا کہلاوے۔ حکیموں نے
کہا ہے کہ جب خلق اللہ کے بندوبست کی ڈوری ایسے بزرگ کے قبضۂ
اقتدار میں رہے تو زمانہ کا انتظام کا سررشتہ بخوبی مستحکم ہو اور اس کے
مبارک ڈور کی تاثیر سے کنبے اور نسل میں برکت پیدا ہو روایت ہی کہ
کسریٰ کے خزانہ میں ایک تھیلا پایا اس میں گیہوں کے دانے
از بسکہ بڑے بڑے چھوہارے کی مثال تھے اُس تھیلے پر لکھا تھا کہ جس زمانہ
میں بادشاہوں کی عدالت نہایت کامل تھی برکت اس مرتبہ پر تھی۔
در حقیقت ہے کہ اس زمانہ کو اضح برہان میں حضرت خاقان صاحب
زمان کی عطوفت و رحمت کی برکت سے تھوڑی مدت کے بیچ ہر طرح
کی جمعیت و خاطر جمعی اہل بلاد اور کافہ عباد کو پہنچی اور ملکوں کا میدان
جو ظالموں کے ظلم سے پائمال ہلاکت ہو گیا تھا آبادی پر آیا یہ نشانی
نزولِ رحمت اور علامت حصولِ برکت کی ہے۔ بیت

خدایا تو ملک اس سے آباد رکھ　　دلِ خلق کو خرم و شاد رکھ"

مولوی امانت اللہ نے اخلاق جلالی کا ترجمہ کرتے وقت اصل کتاب میں سے محقق دوانی کا دیباچہ اور دعائے حضرت خاقان اور ذکر القاب ہمایون بادشاہزادۂ اسلام وغیرہ کا ترجمہ نظر انداز کر دیا اور اس کی جگہ لارڈ ویلزلی گورنر جنرل ہند" اور کپتان جیمس مونٹ مدرس تفریق ہندی مدرسۂ عالیہ" کی مدح سے بھر دی مگر متن میں جہاں ضمناً حضرت خاقان کی مدح آئی ہے اس کو خارج کرنا بھول گئے اور جوں کا توں ترجمہ کر ڈالا چنانچہ ہم نے اوپر جو بیان نقل کیا ہے اس میں بھی ایسا ایک ٹکڑا آ گیا ہے جو ان کی نظر سے بچ گیا اور اردو ترجمہ بھی بحال رہا۔ ساری کتاب میں جہاں جہاں آیات قرآنی اور احادیث نبوی اور عربی امثال تھے ان کو بھی اردو میں ترجمہ کر کے لکھا ہے اور اصل عربی عبارت نہیں لکھی البتہ ادعیۂ ماثورہ کو بتمامہ عربی میں رہنے دیا۔ اصل فارسی کا خاتمۃ الکتاب بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں مولوی امانت اللہ نے خود کو مترجم تفریق ہندی اور کپتان جیمس مونٹ کو مدرس تفریق ہندی بتایا ہے تفریق سے ان کی مراد سکشن یا شعبہ ہے اور چونکہ اس زمانہ میں عام طور پر اردو کو ہندی اور ہندوستانی کہتے تھے اس لیے اس سے ان کی مراد صرف اردو ہی ہے۔

صرف اردو مولوی امانت اللہ کی دوسری تصنیف صرف اردو منظوم ہے جیساکہ اس کے نام سے ظاہر ہے یہ اردو کی مختصر سی نظمیہ گرامر ہے

صرف ونحو کے مسائل نثر میں پڑھتے پڑھتے طبیعت اُکتا جاتی ہے اور پھر بھی طلبا کو یاد نہیں ہوتے اس لیے مولوی امانت اللہ نے صرف کے ابتدائی مسائل کو نظم کر دیا تاکہ طلبا اس کو آسانی سے حفظ کر سکیں۔ اور جب کبھی کسی مسئلہ کی طرف رجوع کرنا پڑے فوراً حافظہ پر بار ڈال کر وہ اشعار دُہرالیں۔ یہ کتاب ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے شایع ہوی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ اس کے نسخے نایاب ہیں حسن اتفاق سے کتب خانۂ آصفیہ (حیدر آباد) میں اس کا ایک قلمی نسخہ نظر پڑا۔ اس کی کتابت شوال ۱۲۳۴ھ کی ہے اور سکندر آباد عرف حسین ساگر" میں لکھا گیا ہے یہ (۱۵۵) صفحات پر مشتمل اور خوشنما خط میں ہے یہ نسخہ بہت ہی قدیم ہے اور تاریخ تصنیف یعنی ۱۲۲۱ھ کے صرف تیرہ سال بعد لکھا گیا ہے۔ حمد و نعت کے بعد "بیان میں سبب نظم اس رسالہ کے" کے عنوان سے یہ اشعار دیے گئے ہیں پھر صرف اُردو کے ایک ایک مسئلہ کو اجمالی طور پر مثالوں وغیرہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے

گر نہ انسان کی زباں گویا | ہوتی فرق حیواں سے کب ہوتا
برنہ ہو قاعدے پہ گر جاری | ہو مشابہ بصوت جانوری
اس لیے ہر زباں کے دانشور | رکھتے اس کی بنا ہیں قانوں پر
قاعدے ہر زباں کے ہیں دو دو | صرف اور نحو کہتے ہیں جن کو
ہیں یہ دونوں اصول قانوں کے | اور فروع ان کے ماورا ہیں جتنے
صرف ان دونوں میں ہے اقدم ہے | لفظ کا معنے جس سے محکم ہے

گرنا اس قاعدہ کا تو احوط ۔۔۔ ہووے پس گفتگو تیری غلط
اپنے رتبے میں گوہر ایک زباں ۔۔۔ حسنِ ترتیب سے رکھے ہے شاں
اُن میں سے ہے زبان اُردو کی ۔۔۔ ہے لطافت میں معدنِ خوبی
کی نظر میں نے جو تامل سے ۔۔۔ مشتمل قاعدہ پہ پایا اُسے
تب ہی خاطر میں میری تھا خلجان ۔۔۔ طالبوں کو بتاؤں اس کا نشان
جب تھی صرف اس میں اکثر ثابت ۔۔۔ نحو سے اس کی میں ہوا ساکت
دوستوں نے مجھے یہ دی تکلیف ۔۔۔ صرف کو نظم میں کروں تصنیف
گرچہ لایق نہیں میں اس کے ہوں ۔۔۔ گوہر نظم کو کروں موزوں
نظم قانون کی علی التخصیص ۔۔۔ امر دشوار تر ہے بالتخصیص
پر مجھے التماس یاروں کا ۔۔۔ آستین کھینچ اس طرف لایا
الغرض اب خدا کے فضل اوپر ۔۔۔ کر توکل میں اس پہ باندھ کمر
کہ وہی فاتحِ ہدایت ہے ۔۔۔ اور وہی خاتمِ نہایت ہے
یہ رسالہ ہوا فضلِ حق سے تمام ۔۔۔ صرفِ اُردو رکھا میں اس کا نام
سن تھے بارہ سے بست و یک اے یار ۔۔۔ کہ یہ کانِ گہر ہوی تیار ۱۲۲۱ھ

مولوی سید مقبول احمد ؒ جامع الاخلاق پر نظرِ ثانی ؒ کے عنوان سے مضمون لکھتے ہوئے ایک جگہ فرماتے ہیں "نعت شریف کے اندازِ نگارش سے پایا جاتا ہے کہ مذہب شیعہ امامیہ رکھتے تھے لیکن کمال خوبی و قابلیت یہ ہے کہ ترجمہ میں معتقدات کا اظہار کسی پیرایہ میں نہیں ہونے پایا۔ اکابر دین و سلف کرام کے نام نامی اور ذکر گرامی اسی شان ادب اور پرواز عظمت

ےء نظم کی چستی و شستگی کے علاوہ ممکن ہے کہ بعض قوانی بھی قابلِ تامل ہوں! ۱۲

سے لکھتے ہیں جیسے علامہ محقق کے قلم سے نکلے تھے"۔ ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جب مترجم نے اپنے معتقدات کو کسی طور پر بھی ظاہر ہونے نہیں دیا بلکہ مصنف نے جس طرح بزرگانِ دین وسلف کرام کا ذکر کیا تھا اسی طرح بیان کیا ہے تو پھر اس کے مذہبی عقاید کے متعلق کیسے رائے زنی کی جا سکتی ہے۔ رہا نعت شریف کا اندازِ نگارش ہم اس میں بھی کوئی بات ایسی نہیں پاتے جس سے ان کے خاص معتقدات کا سراغ ملتا ہو۔ ذیل میں ہم نعتِ رسول صلعم کی اصل عبارت نقل کیے دیتے ہیں۔ ناظرین خود اس سے اندازہ لگالیں کہ اس عبارت سے ان کے معتقدات پر کس قسم کی روشنی پڑتی ہے اور پھر ان کو خواہ شیعہ امامیہ سمجھیں یا مادرزاد سنّی۔ ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک سچے مسلمان اور بلند پایہ عالم تھے ؎

جنگ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

"ہزار ہزار شکر اس کارسازِ حقیقی کا ہے جس نے اس عالم کون وفساد کے بندوبست جزوی کو تدابیر منزل سے محکم اور ممالک ایجاد کے قوانین کلی کو سیاست مدن سے منظم کیا اور بہت آرزو خالق بے نیاز سے ہے کہ اس نے اپنے خواص مخلوقات کو زیور تہذیب الاخلاق سے مہذب اور عوام موجودات کے تئیں ان کی تبعیت سے مادب کیا۔ پس ہمیں لازم ہے کہ مقابل اس نعمتِ عظمیٰ کے سجدے شکر کے بجا لاویں اور ہمیشہ اپنی اوقات کو درستی اخلاق میں مصروف رکھیں تاکہ ظلماتِ صفاتِ رذیلہ سے نجات پا کر حسنِ اعمال کی صراط مستقیم پر جو موجب وصول مکان مقصود کا

ہے آویں لیکن پہچان اس راہ کی بے ہدایت انبیا و رسل کے نہیں ہو سکتی پھر اس میں چلنا بغیر روشنی شمع نبوت کے ممکن نہیں علی الخصوص تجلی انوار سے مشکوٰۃ ایوان رسالت کے اور پرتو نورانی سے چراغ خاندان نبوت کے، ہدایت کرنے والے راہ اسلام کے بتانے ہارے معنی کنت کنزاً مخفیاً کے، مضمون فخلقت خلقہا کے، باعث ایجاد عالم، موجب افتخار بنی آدم، خاتم الانبیاء شافع الوریٰ، نبی اور رسول ہمارے محمد مصطفےٰ۔

بیت :- جو اس راہ سے بھٹکے پھر وہ کبھی ۔۔۔ نہ پہنچیگا منزل کو اے متقی
بحقِ رسول و بنی فاطمہ ۔۔۔ خدا میرا ایماں پہ کر خاتمہ

مظہر علی خاں ولاؔ

بہادر علی حسینی کی طرح ولاؔ بھی مشہور ہیں مگر عام طور پر ان کے حالات زندگی اور مؤلفات سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ بدقسمتی سے ان کے مؤلفات میں سے صرف ایک دو کو طباعت و اشاعت کا موقع ملا۔ باقی نہ معلوم کن اسباب و وجوہات کی بنا پر قلمی نسخوں کی حد تک محدود رہیں۔ متداول تذکرے اور خود ان کی تصانیف بھی ان کے حالات سے خالی ہیں۔ چند غیر معروف تذکروں میں بعض کارآمد باتیں دستیاب ہوگئیں اور اس طرح متفرق طور پر جو حالات معلوم ہوئے ہیں وہ بیان کیے جاتے ہیں۔

ان کا اصلی نام جیسا کہ غلام ہمدانی مصحفی اور بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے، مرزا لطف علی تھا مگر وہ مظہر علی خاں کے عرف عام سے مشہور ہیں اور اپنی تالیفات میں بھی انھوں نے اپنا یہی نام لکھا ہے ان کے والد سلیمان علی خاں وداد عرف میرزا محمد زماں فارسی کے مشہور شاعر تھے اور دادا محمد حسین علی قلی خاں کے خطاب سے مفتخر اور شرفائے دہلی میں شمار ہوتے تھے۔ مظہر علی خاں کا مولد و وطن دہلی ہے ان کی نشو و نما اور تربیت بھی دہلی ہی میں ہوئی۔ ان کے تخلص کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں اختلاف ہے۔ خود ان کے اور بعض معاصرین کے بیان سے ولاؔ تخلص ثابت ہوتا ہے مگر مصحفی، باطن اور مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ولاؔ لکھا ہے۔

ولا بقول شیفتہ ممنون کے شاگرد تھے ممنون شاہ جہاں آباد کے قریب سونی پت کے رہنے والے تھے ان کے والد قمرالدین منت بھی مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ممنون نے تحصیل علم اپنے والد ہی سے کی اور ایک زمانہ لکھنو میں بسر کیا نیز ایک عرصہ دراز تک دارالخلافہ دہلی میں بادشاہ کے دربار میں بہ زمرۂ شعرا ملازم اور فخر الشعرا کے خطاب سے سرفراز رہے۔ تذکرہ گلشن بے خار کی تالیف یعنی ۱۲۵۰ھ میں بقید حیات اور اجمیر شریف کے کوہستان میں مقیم تھے شیفتہ نے اُن کے کلام کی تعریف کی ہے۔ ولا نے ممنون کے سوا مرزا جان طپش اور غلام ہمدانی مصحفی سے بھی مشورہ سخن کیا ہے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے پائی تھی اور اس پر عالمانہ عبور رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ ولا صاحب دیوان ہیں اور ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا اس کے علاوہ کسی اور کتب خانہ میں ان کے دیوان کا پتہ نہیں چلا۔

شیفتہ اور جہاں کے تذکروں میں یہ دو شعر ملے۔

یوسف کا نقشہ در و دیوار پہ کھینچا کیوں تو نے زلیخا نہ دل زار پہ کھینچا

ہمدم فقط نہ مجھ کو ہی اس گل نے غش کیا آیا جو انجمن میں تو بس گل نے غش کیا

فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے ساتھ ہی وہ بھی اس میں ملازم ہو گئے۔ اور فارسی ہندی کتابوں کا ترجمہ کرنے لگے۔ ان کا نہ تو سنہ ولادت معلوم ہے اور نہ سنہ وفات کا کچھ پتا چل سکا۔ البتہ بینی نارائن جہاں نے اپنے تذکرہ "دیوان جہاں" میں جو ۱۸۱۴ء م ۱۲۲۷ھ میں تالیف ہوا ہے۔۔۔۔

ان کو بقید حیات اور کلکتہ میں مقیم بتایا ہے۔

مادھونل اور کام کندلا

مظہر علی ولاؔ کی مولفات میں بہ لحاظ تاریخ سب سے پہلے "مادھونل اور کام کندلا" کا ذکر کیا جانا چاہیے یہ ان کی پہلی تالیف ہے اور اوائل ۱۸۰۲ء میں مرتب ہوئی۔ در اصل یہ ایک ہندی زبان کا عاشقانہ قصہ ہے۔ جو موتی رام کبیسور نے تصنیف کیا تھا۔ اس میں ایک برہمن مادھونل اور ایک رقاصہ کام کندلا کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہوئی اس کا صرف ایک حصہ ڈاکٹر گل کرسٹ کی "بیاض ہندی" میں چھپا ہے اور ایک قلمی نسخہ کتب خانہ برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ اس کے خاتمۃ الکتاب میں مترجم نے دو تاریخی قطعے لکھے ہیں۔ ایک سے ہجری سال ۱۲۱۵۔ اور دوسرے سے عیسوی ۱۸۰۱ء نکلتا ہے ڈاکٹر محی الدین صاحب قادری زور نے برٹش میوزیم کے نسخہ سے اس کا حسبِ ذیل اقتباس نقل فرمایا ہے۔

"بلند بلند مکانوں کے بالاخانوں کا عالم دیکھ کر آسمان زمین کا عالم تہ و بالا نئے نئے طور کے مکان منقش عالی شانوں پر سنہری کلسوں کے چمکنے سے جھمجھا جالا۔ صاحب علم و ہنر، افعال و نیک کردار اور لوگ اچھے اچھے آرام چین سے اس بستی میں بستے تھے، وہ پہ پاوتی نگری مشہور تھی اور راجہ گوبند چند دانش و بخشش میں یکتا، نیک افعال، خجستہ خصال، مہر سے معمور، علم و حیلے سے مشہور، صورت و سیرت میں خوب، خلق طالب وہ مطلوب، دوست اس کے لطف سے شاد، اور دشمن اس کے قہر سے برباد، جا بجا اس کی دھاک، غرض وہاں کُشا

راجہ اندر کی طرح کرتا تھا اور اس کے محل میں عورتیں ہر ایک ذات کی تھیں لیکن سب سے بہتر اور برتر، پاکیزہ طینت و آراستہ بزیب و زینت، شرم و ادب سے اور علم و ہنر سے مالا مال، اور خوبیوں سے اس کی ساری خلقت خوشحال سامان عیش و نشاط بلکہ سراپا انبساط، شکل و شمایل پری، سراپا غرور سے بھری، عیش و نشاط کے طور سے آگاہ، شکل میں مانند ماہ، گلبن چمن شادمانی، گل گلزار جوانی، ابرو کمان، تیر اس کی ہر ایک مژگان، ناز و عشوے کے اس میں تمام آئین، پنگلا حسین و نازنین، اس کی رانی تھی، اور ایک ادھو نام برہمن خوبصورت و خوش سیرت اس کا بڑا مصاحب تھا

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق نمبر ۳)

ترجمہ کریما ولاؔ نے حضرت شیخ سعدی شیرازی رح (۱۱۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) کے مشہور پند نامہ "کریما" کا بھی اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ پند نامہ سعدی رح فارسی کا بے حد مشہور و معروف منظوم رسالہ ہے اور اردو میں اب تک اس کے متعدد ترجمے ہو چکے ہیں۔ ہماری نظر سے بھی کئی اور اردو ترجمے گزر چکے ہیں۔ ولاؔ نے اس کا ترجمہ ۱۸۰۲ء کے اوائل میں کیا ہے۔ خاتمہ پر حسب ذیل قطعہ تاریخ درج ہے۔

کریما کا جب ترجمہ کر چکا — تو مجھ سے مری طبع نے یہ کہا
کہ تاریخ کہہ یادگارانہ طور — سن عیسوی کے موافق بفور
اسی فکر میں تھا کہ آئی ندا — "ہوا ترجمہ نظم میں یہ ولاؔ"

پہلی مرتبہ ڈاکٹر گل کرسٹ نے باغ اردو مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۲ء کے ساتھ بطور ضمیمہ شایع کیا تھا اس کے بعد "اتالیق ہندی" مطبوعہ کلکتہ ۱۸۰۳ء کے ساتھ بھی

شایع ہوا ۔ ہمارے پاس اس کا ایک قلمی نسخہ ہے ولاؔ نے نہایت صاف اور بامزہ ترجمہ کیا ہے اور اکثر و بیشتر اشعار میں اصل فارسی کی خوبی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ذیل میں چند شعر نقل کیے جاتے ہیں ترجمہ کی خوبی بعض صورتوں میں بے حد قابل داد ہے۔

مرے حال پر کر تو بخشش خدا — کہ ہوں میں گرفتار حرص و ہوا
نہیں ہے ہمیں داد رس تجھ سوا — تو ہی بخشش دے عاصیوں کے گناہ
گنہ سے مجھے باز رکھ اے خدا — گنہ بخش اور راہ نیکی دکھا
زباں کو دہن بیچ جب تک ہی جا — ہے مقبول دل کو نبی کی ثنا
ہے نبیوں سے بہتر حبیب الٰہ — کہ عرش بزرگ اس کا ہے تکیہ گاہ
وہ ہے شہسوار براق ایسا جو — کہ اک پل میں آیا فلک پر سے ہو
تری عمر کے گذرے چالیس سال — نہ طفلی کا اب تک گیا وہ خیال
ہوا و ہوس میں گزاری سدا — نہ تو نیک کاموں میں اک دم رہا
بھروسا نہ کچھ عمر فانی پہ کر — زمانے کی بازی سے مت ہو نڈر

(ترجمہ پند نامہ سعدی قلمی صفحہ ۲۰)

ہفت گلشن ملّا کا تیسرا کارنامہ ہفت گلشن ہے یہ کتاب فارسی زبان میں ناصر علی خاں واسطی بلگرامی نے لکھی تھی ولاؔ اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ۱۲۱۶ھ کے اواخر میں اس کا ترجمہ کیا ہے ۔ اس کتاب کا موضوع تہذیب اخلاق ہے اور چونکہ ساری کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے اور ہر ایک باب گلشن کے نام سے موسوم ہے ۔ اس لیے اس کا نام ہفت گلشن رکھا گیا اس میں مشرق کی دیگر اخلاقی کتابوں

کی طرح معاشرت، گفتگو کے آداب اور احکام اور بالا دستوں کی اطاعت و فرمانبرداری کی تعلیم دی ہے۔ مضامین کی مناسبت سے اخلاقی قصے اور حکایتیں بھی بیان کی گئی ہیں احادیث نبوی صلعم اور حضرت علیؓ کے زرین امثال و اقوال سے کتاب کے مضامین کو زیادہ قابل قبول بنایا گیا ہے یہ کتاب بھی طبع نہیں ہوئی ہے اور اس وقت تک صرف ایک قلمی نسخہ کا پتہ چلا ہے اور وہ برٹش میوزیم میں ہے ممکن ہے کہ یہی مولف کا مسودہ ہو۔ ذیل میں اس کا ایک اقتباس جو ڈاکٹر زور صاحب نے اپنی عنایت سے برٹش میوزیم کے نسخے سے نقل کر کے بھیجا ہے۔ درج کیا جاتا ہے۔

حکایت چوتھی، مرغی اور سور کی ہے کہ ایک مرغی دانے کی تلاش میں جنگل کو گئی اور ہر طرف دانہ چگنے لگی کہ ناگاہ ایک سوراخ پاس انڈے کتنے ایک مار سیاہ کے پائے تب خوش ہو کر نہایت شفقت و مہربانی سے ایک درخت کے نیچے ان انڈوں کو اکٹھا کر کے اپنے پروں کے نیچے لے بیٹھی اور سینے لگی۔ یہ تمام احوال طاؤس نے اس درخت کے اوپر سے دیکھ کر کہا اے مرغی یہ کیا خیال فاسد تیرے دل میں آیا ہے مگر انڈے سانپ کے نہیں پہچانے ہیں تو نے۔ بہتر یہ ہے کہ اس بلا سے دست بردار ہو ورنہ جس وقت کہ بچے انڈوں میں سے نکلیں گے تو تجھے ڈس لیں گے اس بے ہوش نے اس کی بات کو نہ سنا اور اپنے کام میں بدستور مشغول رہی لیکن بعد گزرنے چالیس روز کے بچے انڈوں میں سے مانند خراطین کے ایک بارگی جو نکلے تو سارے بدن میں اس کے چمٹ گئے یہاں تلک کہ کام اس کا تمام کیا۔ فائدہ اس قصے سے یہ ہے کہ جو کوئی نصیحت یار صادق کی اور دوست مشفق کی نہ سنے آخر کار رو رہ پشیمانی کھینچتا ہے اور اسی طرح سے ہلاک ہوتا ہے۔

(قلمی نسخہ برٹش میوزیم ورق ۵)

آتالیق ہندی | ڈاکٹر گل کرسٹ ہی کی نگرانی میں ولا نے ایک کتاب "آتالیق ہندی" مرتب کی تھی۔ اس میں فارسی پڑھنے والوں کے مطالعہ کی بہبود کے لیے اخلاقی اسباق و حکایات بیان کی گئی ہیں۔ یہ کتاب کلکتہ سے ۱۸۰۳ء میں شایع ہوئی تھی اور اس کی تالیف میں کالج کے دوسرے اہل قلم نے بھی انکی مدد کی ہے۔

بیتال پچیسی | ولا کا سب سے زیادہ مشہور کارنامہ "بیتال پچیسی" ہے یہ کتاب ابتداءً سنسکرت زبان میں لکھی گئی ہے، بارہویں صدی ہجری میں بہ عہد محمد شاہ، سورت کبیسور نے برج بھاشا میں اس کا ترجمہ کیا تھا اس برج بھاشا کے نسخہ سے ولا نے ۱۸۰۳ء م ۱۲۱۷ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے۔ اس میں پچیس کہانیاں ہیں اور چونکہ ان کہانیوں کا راوی ایک شخص بیتال نامی ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام "بیتال پچیسی" رکھا گیا۔ بیتال ایک مردہ ہے جو قوم کا تیلی تھا اس کو کسی جوگی نے مسان (یعنی قتل کرکے درخت سے لٹکا کر بھوت) بنا رکھا تھا اس نے بھوت بنکر یہ کہانیاں بیان کی ہیں۔ اس کے ترجمے میں سری للولال کوی نے ولا کو بہت کچھ مدد دی ہے۔ للولال بھی فورٹ ولیم کالج میں ہندی و سنسکرت کے مترجم تھے ان کا حال آگے بیان کیا جائیگا۔

"بیتال پچیسی" پہلے کلکتہ سے شایع ہوئی اور ایک عرصہ تک مقبول خاص و عام رہی۔ اس کے متعدد ایڈیشن ہندوستانی مطابع سے نکل چکے ہیں اور اب تک قدیم قصوں کی کتابیں فروخت کرنے والوں کے ہاں اس کے نسخے نظر آتے ہیں۔ آج کل قدیم قصوں کی طرف سے لوگوں کی توجہ ہٹتی جاتی ہے اور انکی جگہ ناول اور مختصر افسانوں نے لے لی ہے اول تو ان قدیم قصوں میں فوق العادت بلکہ

بعض مرتبہ فوق الفطرت باتوں کا طومار لگا رہتا ہے اور پھر ان کی زبان اور
طرز بیان میں بھی فرسودگی پیدا ہو گئی ہے اور فسانہ نویسی نے بھی ترقی کے اتنے
مدارج طے کر لیئے ہیں کہ اب ان قدیم قصّوں کی پہلی سی دل کشی کا باقی رہنا
ممکن نہیں ۔ پھر بھی اس زمانہ کی چند مخصوص کتابیں ایسی ہیں کہ ایک سو سال سے
زیادہ مدت گزر جانے اور زبان و طرز بیان میں زبردست انقلابات رونما
ہونے کے باوجود ان کی بہار تازہ ہے اور اب بھی انہیں اسی شوق اور لطف
سے پڑھا جاتا ہے ان میں سے ایک تو "باغ و بہار" ہے اس کی زبان اور
طرز بیان میں ایسی دل کشی ہے کہ اردو زبان کا شیدا چٹخارے لے کر پڑھے بغیر
نہیں رہ سکتا ۔ اگر چند متروک الفاظ اور ترکیبوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور بعض
خلاف عقل و عادت باتوں سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو اس کی زبان اب
بھی ٹھیٹ روزمرہ کا بہترین نمونہ اور اس کا مواد دلچسپی سے پڑھنے کے قابل ہے۔
"بتیال پچیسی" میں ہندی الفاظ کا استعمال اس کثرت سے ہوا ہے کہ گویا
اصل بھاشا کی کتاب کو دیوناگری رسم الخط سے اردو رسم الخط میں منتقل کر دیا گیا ہے
بعض الفاظ بہت بعید از فہم اور اردو زبان میں داخل ہونے کے لائق ہی نہیں
معلوم ہوتے اس میں کوئی شک نہیں کہ ولا نے اس کی زبان کو سلیس اور با محاورہ
رکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہندی الفاظ کی موقع بے موقع بھرمار نے سلاست
وصفائی کو بگاڑ دیا ہے۔ ایک حکایت کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔ اس سے
مذکورۂ بالا بیان کی تصدیق ہو جائیگی ۔
ایک راجہ پرتاپ مکٹ نام بنارس کا تھا اور اس کے بیٹے کا نام بجر مکٹ جسکی

ناری کا نام مہادیبی ایک دن کنور اپنے دیوان کے بیٹے کو ساتھ لے کر شکار کو
گیا اور بہت دور جنگل میں جا نکلا اور اس کے بیچ ایک مندر نایاب دیکھا
کہ اس کے کنارے ہنس، چکوی چکوا، بگلے، مرغابیاں سب کے سب کلول کیا
تھے۔ چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوے۔ کنول تالاب میں پھولے ہوئے
کناروں پر طرح طرح کے درخت لگے ہوئے کہ جنکی گھنی گھنی چھانھ میں ٹھنڈی
ہوا آتی تھی اور پنچھی پکھیرو درختوں پر چہچہوں میں تھے اور رنگ برنگ
کے پھول بن پھول رہے تھے۔ ان پر بھونروں کے جھنڈ کے جھنڈ
گونج رہے کہ اس تالاب کے کنارے پہنچ اور منھ ہاتھ دھو کر اوپر آئے
وہاں ایک مہادیو کا مندر تھا۔ گھوڑوں کو باندھ، مندر کے اندر جا، مہادیو کا
درشن کر باہر نکلے جتنی دیر ان کو درشن میں لگی تھی اس عرصے میں کسو راجہ
کی بیٹی سہیلیوں کا جھنڈ ساتھ لیئے ہوئے اُسی تالاب کے دوسرے
کنارے پر اشنان کرنے آئی سو اشنان دھیان پوجا کر سہیلیوں کو
ساتھ لے درختوں کی چھاتھ میں ٹہلنے لگی۔ اُدھر دیوان کا بیٹا بیٹھا اور
راجہ کا بیٹا پھرتا تھا کہ اچانک اس کی اور راجہ کی بیٹی کی چار نظریں ہوئیں۔
دیکھتے ہی اس کے روپ کو راجہ کا بیٹا فریفتہ ہوا اور اپنے دل میں کہنے لگا کہ
اے چنڈال کام دیو مجھ کو کیوں ستاتا ہے اور راج پتری نے اس کنور کو دیکھ
سر میں جو کنول کا پھول پوجا کر کے رکھا تھا وہی پھول ہاتھ میں لے کان سے
لگا دانت سے کتر پاؤں تلے دبا۔ پھر اٹھا چھاتی سے لگا لیا اور سہیلیوں کو
ساتھ لے سوار ہو اپنے مکان کو گئی اور یہ راج پتر نہایت تراس ہو رہ میں ڈوبا ہوا
دیوان کے پاس آیا او رساتھ شرم کے اس کے آگے حقیقت کہنے لگا:

تاریخ شیر شاہی ولا کا ایک اور یادگار کارنامہ "تاریخ شیر شاہی" ہے۔ یہ شیر شاہ سوری افغانی بادشاہ دہلی (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) کے عہد کی مکمل تاریخ ہے۔ اور شہنشاہ جلال الدین اکبر کے حکم سے عباس خان بن شیخ علی شروانی نے فارسی میں لکھی تھی۔ کپتان جیمس مونٹ کے ایما سے ولا نے ۱۸۰۵ء میں اس کا اردو ترجمہ کیا۔ خاتمۃ الکتاب میں ختم شدہ اردو ترجمہ "تاریخ شیر شاہی بہ تاریخ ۵ رجمادی الاول ۱۲۲۰ھ م ۲ر اگست ۱۸۰۵ء" درج ہے گارسان دتاسی نے اسکو فرانسیسی میں ترجمہ کرکے پیرس سے ۱۸۶۵ء میں شایع کیا تھا۔ اصل اردو ترجمہ ابتک شایع نہیں ہوا۔ کتب خانہ محکمہ ہند (لندن) میں ایک قلمی نسخہ غالبًا اصل مسودہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر زور صاحب نے اس کی نقل بھیجی ہے معلوم ہوتا ہے کہ لفظی ترجمہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

"اس نے کہا اپنے بھائی میرداد کو شیر خاں کے پاس بھیجے تا وہ اس سے یہ قرار داد کرے کہ ہم قلعہ دیتے ہیں لیکن اس شرط کہ تو عہد کرے کہ جس بیٹے بدبخت نے اپنے باپ کو مارا ہے اسکی ناک اور کان کاٹے تا اوروں کو کان ہوں۔ جب میرداد شیر خاں کے پاس گیا اس سے بہ قسمیہ عہد و پیمان کیا کہ لاڈ ملکہ اور تم تینوں بھائیوں کے ساتھ کسی نوع کی مخالفت نہ کرونگا اور مہمانداری کی رسم بخوبی بجا لایا۔ کوئی فروگذاشت نہ کی اور اس کے آنے سے نہایت خوش ہوا۔ محبت و اخلاص حد سے زیادہ کیا اور کہا کہ اگر لاڈ ملکہ میرے تیں قلعہ دیدے اور مجھ سے نکاح کرے تو میں اس کا نہایت ممنون احسان ہونگا۔ مرغ دل کا شکار کرنا احسان سے

خوب ہے اور اچھے کاموں سے ہے پیر داد نے کہا کہ خزانہ اور قلعہ سوائے بادشاہ کے دینا مناسب نہیں ہے لیکن جو بندہ آپ کی ملازمت میں آیا اور تم نے بہت اشتیاق آرزو و تمنا اظہار کی اور میرا بھی اعزاز و اکرام بہت سا کیا اور مہمانداری کا حق جتنا چاہیے بجا لائے۔ میرے دل میں بدلا اس کا سوائے اس کے کوئی نہیں آتا کہ یہ قلعہ تمہارے ہاتھ آوے اور میں بہ مقدور اپنے تئیں اس کی سعی میں قصور نہ کرونگا (تاریخ شیر شاہی قلمی ۱۴۵)

جہانگیر نامہ گارساں دی تاسی کا بیان ہے کہ ولا نے تزک جہانگیری کے ایک حصہ کا ترجمہ جہانگیر نامہ کے نام سے کیا ہے اس میں جہانگیر کی تخت نشینی سے چھٹے سال جلوس یعنی ۱۶۱۰ء تک کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں اس کا ذکر کسی اور ذریعہ سے دریافت نہ ہو سکا اور ہم ٹھیک طور پر اس کے متعلق کچھ نہیں لکھ سکتے۔

ولا کی تالیفات میں بہ لحاظ زبان و طرز بیان بے حد فرق ہے۔ ہر کتاب اپنی اصل پر مبنی ہے۔ کسی میں ہندی الفاظ کی کثرت ہے تو کسی میں فارسی طریقہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے دیگر ارباب قلم کے مقابلہ میں ولا کی زبان زیادہ پرانی نظر آتی ہے اس میں بعض قدیم ترکیبیں دوسروں کے مقابلہ میں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

مرزا جان طپش

طپش کا نام اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ منشیوں اور اہل قلم میں شامل نہیں ہے مگر وہ بھی ایک زمانہ میں فورٹ ولیم کالج کے متوسل تھے اور دوسرے مترجمین کی کتابوں کی نظر ثانی اور اساتذہ قدیم کے کلام کے انتخاب اور دیگر تالیفی کام ان کے سپرد تھے۔ اس کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے وہ کلکتہ میں بہت ممتاز تھے اور کالج نے ان کا کلیات خرید کر شایع بھی کیا تھا اس لحاظ سے وہ بھی اس کالج کے ارباب قلم میں شامل اور مستحق توجہ ہیں طپش کے شاعر ہونے کی وجہ سے اردو کے اکثر تذکروں میں ان کے حالات ملتے ہیں ان کا اصلی نام مرزا محمد اسمٰعیل ہے مگر وہ مرزا جان کے عرف سے بہت مشہور تھے۔ ان کے آباد اجداد بخارا کے رہنے والے تھے اور ان کا سلسلہ نسب بخارا کے مشہور بزرگ اور صوفی سید جلال الدین المعروف بہ جلال بخاری تک پہنچتا ہے ان کے والد مرزا یوسف بیگ سپاہی پیشہ آدمی تھے۔ کسی تذکرہ نویس نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے والد کب اور کس کے عہد حکومت میں ہندوستان آئے۔ البتہ یہ تحقیق ہے کہ طپش دہلی میں پیدا ہوئے صرف ڈاکٹر قیلین کا قول ہے کہ طپش کی ولادت ۱۱۸۲ھ میں ہوئی۔ طپش نے دہلی ہی میں نشو و نما پائی اور ان کے بچپن اور جوانی کا بہت بڑا حصہ علمائے دہلی کی صحبت میں گزرا اور علم و ادب کے باکمالوں کے ہاتھوں تربیت پائی۔ طپش نے عربی فارسی کے

علاوہ سنسکرت زبان بھی سیکھی اور اس میں خاص مہارت بہم پہنچائی تھی طبقات الشعرائے ہند کے مولف منشی کریم الدین کا بیان ہے کہ طپش کو فن بلاغت میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی اور اس کی تحصیل مرزا محمد یار بیگ سائل سے کی تھی اور دہلی میں پیدا ہونے اور وہیں تعلیم و تربیت پانے کی وجہ سے اہل دہلی کے مخصوص محاوروں اور روزمرہ سے بخوبی واقف تھے طپش ابتداءً شاہ عالم بہادر کے ولی عہد مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے دربار میں ملازم ہوئے وہ موروثی سپاہی پیشہ تھے اور جہاندار شاہ کے ہاں بھی فوجی خدمت ہی پر مامور ہوئے۔

منشی کریم الدین ہی کا بیان ہے کہ طپش کو شعر گوئی کا شوق ۱۱۹۸ھ میں ہوا پہلے مرزا محمد یار بیگ سائل کے جن سے عروض و بلاغت سیکھی تھی شاگرد ہوئے اور پھر چند روز بعد حضرت خواجہ میر درد کو کلام دکھانے لگے۔ مرزا محمد یار بیگ دہلوی اور قوم ازبک سے تھے۔ ان کو شاہ حاتم اور سودا سے تلمذ حاصل تھا۔ سائل بہت گمنام شاعر ہیں ان کے نہ تو حالات ہی ملتے ہیں اور نہ کلام شائع ہوا ہے۔ صرف تذکرہ سخن شعرا مولفہ عبدالغفور خاں نساخ میں تین شعر نظر پڑے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اچھے شاعر تھے اور پر کیف اشعار کہتے تھے۔ طپش کا تخلص مصطفیٰ خاں شیفتہ مولف گلشن بے خار اور قطب الدین خاں باطن مولف گلستان بیخزاں نے تائے فوقانی سے لکھا ہے مگر نساخ سخن شعرا میں لکھتے ہیں۔

"مرزا جان طپش کے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلوں میں تخلص انکا طائے حطی سے

لکھا تھا۔ اس لیے میں نے "تا، فوقانی سے نہیں لکھا"
طپش ۱۱۹۸ھ کے اواخر میں مرزا جہاندار شاہ کی معیت میں لکھنو آئے یہی زمانہ جیسا کہ مولف طبقات الشعرائے ہند کے بیان سے ظاہر ہے ان کی شاعری کے آغاز کا ہے۔ شہزادہ کے دربار میں ہر وقت شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا اور شعرائے عہد و اساتذۂ وقت اپنے افکار طبع سے مجلس گرم رکھتے تھے طپش کی مشق شعر گوئی بڑھنے لگی ۔ اور ہر وقت کی شاعرانہ صحبتوں نے شاعری کے نکات و محاسن اور معائب کے پرکھنے کی اچھی خاصی صلاحیت پیدا کر دی۔ پھر اس پر طبیعت کا فطری میلان اور علمی قابلیت سونے پر سہاگہ تھی۔ شہزادہ جہاندار شاہ کئی دن تک نواب آصف الدولہ کے ہاں رہ کر بنارس گئے ان کے ہمراہ طپش بھی روانہ ہوئے اور غالباً ان کے انتقال ۱۲۰۱ھ تک وہیں رہے ان دنوں بنارس میں نواب علی ابراہیم خاں مولف گلزار ابراہیم ناظم فوجداری تھے ۔ وہ بھی بڑے سخن سنج اور بلند پایہ شاعر تھے وہاں بھی شعر و شاعری کا خوب چرچا رہا۔

مرزا جہاندار شاہ کے انتقال کے بعد وہ تمام صحبتیں درہم برہم ہو گئیں اور طپش نے بھی بنارس سے نکلکر تلاش معاش میں صوبۂ بنگال کا سفر کیا اور ڈھاکہ میں نواب سید احمد علی خاں شمس الدولہ کے مصاحب مقرر ہوئے ۔ اسی زمانہ میں نواب مذکور کے ایما سے اپنی کتاب "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" لکھی ۔ ٹھیک طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کلکتہ میں کب آئے ۔ غالباً فورٹ ولیم کالج کے افتتاح کے قریبی زمانہ میں کلکتہ آچکے تھے

یہاں انہوں نے کالج کی طرف سے جو کتابیں ترجمہ ہوتی تھیں انکی نظر ثانی کا کام شروع کیا مگر خود کسی کتاب کا ترجمہ نہیں کیا البتہ انہوں نے ایک فارسی زبان کے قصہ کو بہار دانش کے نام سے لکھا ہے مگر یہ بھی منظوم ہے۔ ۱۸۱۱ء میں ان کا کلیات بھی کالج کی طرف سے شایع ہوا ۱۸۱۳ء تک کلکتہ میں مقیم تھے اور غالباً اس کے بعد کلکتہ ہی میں وفات پائی ہے۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ ۱۲۳۹ھ م ۱۸۱۶ء سے قبل فوت ہوئے۔

کلیات طپش کے کلام کی تعریف میں تقریباً تمام تذکرہ نویس رطب اللسان ہیں۔ مولف طبقات شعرائے ہند لکھتے ہیں "اس کے شعر بہ سبب صفائی اور فصاحت اور تازہ مضمون ہونے کے مشہور ہیں"۔ خمخانۂ جاوید کے مولف کی رائے ہے "شعر سے دلی عشق تھا۔ چنانچہ زبان میں صفائی فصاحت اور مضمون کی تازگی کلام کا لطف بڑھاتی ہے"۔ اسی طرح نساخ شیفتہ اور باطن نے بھی تعریف کی ہے۔ طپش ایک کہنہ مشق شاعر اور شاعری کے رموز و نکات سے آگاہ تھے۔ اور اپنے ہم عصر شعرا کی طرح صفائی زبان کو اپنا جوہر سمجھتے تھے۔ کلکتہ میں کالج کی جانب سے ہر سال جو مشاعرہ ہوا کرتا تھا اس میں گیارہویں سال یعنی ۱۸۱۲ء میں ان کے کلیات کا ایک نسخہ کالج نے خرید لیا اور ان کی شاعرانہ قابلیت کے اعتراف میں گراں قدر صلہ دیا۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے کالج کی جانب سے یہ کلیات شایع ہوا تھا مگر اب اس کے نسخے بالکل ناپید معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف تذکروں میں کوئی (۲۵) شعر منقول ہیں۔ گلشن بے خار کے انتخابی

اشعار نموناً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں شیفتہ کی سخن سنجی نے ان کو پسند کیا ہے :-

کچھ تیرے سلیقے سے پھنسے ہم نہیں صیاد
لائی ہے ہمیں دام میں تقدیر ہماری

کس کی طرف سے آج طپش تجھ کو پاس ہے
سچ کہہ ہمارے سر کی قسم کیوں اداس ہے

آتے تو ہو کہیں سے آخر ملے ولے تم
کیا ہوا اگر مرے بھی لگ جاؤ پھر گلے تم

تم تو کہتے ہو کہ دم کے بعد آجاتا ہوں میں
پر خدا جانے ہمیں دم کا بھروسہ کچھ نہیں

ہمیں تو اشک کے قطرہ کا بھی ہے تھامنا مشکل
بھلے وہ لوگ ہیں جنکے تئیں دل تھام آتا ہے

قطعہ

ہر طرف آج ہے بسنت دھوم کی
سیر میں ہے ہر اک تماشائی

کتنے گلرو جو ہیں بسنتی پوش
جی میں کھٹکے ہے جن کی رعنائی

کہتے ہیں آن کے مجھے ہنس ہنس
دیکھ کر میری ناشکیبائی

ہو مبارک تمہیں جنون طپش
پھر نئی رت نئی بہار آئی

شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان

طپش کا یادگار اور گراں قدر کارنامہ "شمس البیان فی مصطلحات ہندوستان" ہے یہ کتاب رند و محاورات اور روزمرہ پر ۱۲۰۷ھ م ۱۷۹۳ء میں شمس الدولہ رئیس ڈھاکہ کے ایما سے لکھی گئی ہے اور انہی کی خطابی مناسبت سے اس کا نام شمس البیان رکھا گیا ہے۔ اس موضوع پر غالباً یہ سب سے پہلی کتاب ہے اور موجودہ معلومات کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے کسی شخص نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔ اس سلسلہ میں

سید انشا کی "دریائے لطافت" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس کتاب میں
قواعد زبان کے علاوہ اہل دہلی کے محاوروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے مگر یہ بھی
اس کے بعد کی تالیف ہے۔ اور اس کا سنۂ تالیف سنہ ۱۲۲۲ھ ہے
شمس البیان سنہ ۱۲۶۵ھ میں مرشد آباد سے شایع ہوئی تھی اس کا صرف
یہی ایک ایڈیشن نکلا۔ دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس ایڈیشن کے
نسخے اب بالکل نایاب ہیں ہمارے عنایت فرما مولوی عمر یافعی کے یہاں
مولوی میر احمد علی صاحب عصر مرحوم حیدرآبادی تلمیذ حضرت فیض رحمۃ اللہ علیہ
کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے اس کی کتابت سنہ ۱۲۸۳ھ کی ہے
مولوی عمر یافعی نے رسالہ تحفہ حیدرآباد میں اس پر ایک محققانہ مضمون
بھی تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ گویا تاریخ تالیف کے (۶۲) برس بعد کا لکھا
ہوا ہے۔

اس میں مصطلحات و محاورات کی تشریح و تصریح اس زمانہ کی
عام عادت کے موافق فارسی میں کی گئی ہے۔ نفس مضمون سے پہلے
ایک فارسی دیباچہ بھی ہے جو ادبی شان سے خالی نہیں اور یہ اُس عہد
کی فارسی تحریروں کی طرح مقفےٰ طرز میں ہے اس کا کچھ حصہ جس سے
وجہ تالیف وغیرہ پر روشنی پڑتی ہے ملاحظہ ہو۔

"بعد تحمید حضرت سخن آفرین کہ زبان انسان را بانواع مقال
قدرت گویائی بخشیدہ و پس از تحمید نعت خاتم النبیین کہ نکتہ سنجان
دقیقہ رس را بہ فیضان نطق و بلاغت مشرف گردانیدہ۔ ذرہ بےمقدار

ہیچمدان متخلص بہ طپش مرزا جان معروض رائے محاورہ دانان
فصیح زبان ولطیفہ شناسان صحیح بیان گرداند کہ در خاطر عاطر
امیر بلا تنظیر .... نواب سپہر جناب امیر الممالک
شمس الدولہ سید احمد علی خاں ذوالفقار جنگ دام اقبالہ
وعم افضالہ خطور نمود کہ نسخہ مشتملبر توضیح اصطلاحات دیار دہلی
و روزمرہ فصحائے اُردوئے معلی آنچہ در بعضے اشعار منظوم
می گردد۔ ہم فہم دوردستان ہر آناں کہ در امصار بعید
واقع اند بہ ادراک کنہش نمی رسد بہ زیور تالیف آراستگی
یابد تا مطالعہ آن انواع کفایت را صراحت بخشد و بر طالبان
ایں فن کار آسان گردد۔ انشاءالّا لامرہ تحصیل ایں سعادت
واجب دیدم و بہ تقدیم ارشاد مصروف گردیدم۔ اما چوں ایں
نسخہ ایست امیں مصطلحات ریختہ بہ اصناف لطائف معنوی
آمیختہ لہذا بہ رعایت خطاب کار فرما موسوم بہ "شمس البیان
فی مصطلحات ہندوستان" گردید۔ در سنہ یک ہزار و دو صد
و ہفت از ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم در شہر محرم الحرام
بتاریخ بست و دوم در بلدہ مرشد آباد بہ اتمام رسید ....
بر ضمائر ارباب بصائر پوشیدہ نماند کہ اصطلاحات مرقومہ ایں نسخہ
متنوع است۔ بر دو نوع۔ نوعے را بہ محاورۂ عوام اختصاص و نوعے
از روزمرہ خواص علی ای حال ہرچہ در محاورہ آں دیار مستعمل است

برائے دور دستان مستند و انچہ در روز مرہ آن بلاد مروج است
عزیزان بعید را سند، چہ ہندی عبارت از زبان موزونان دہلی
است۔ پس ہر چہ مطابق آن باشد صحیح و انچہ ورائے آنست
غلط و قبیح بالجملہ حرفے چند مرقوم نمود .... "

مؤلف نے نہایت محنت و جانفشانی سے کام لیکر (۲۷۵) محاوروں کو ردیف وار مرتب کیا ہے اور ہر ایک محاورہ کی سند میں حتی الامکان شعرائے مشاہیر کے شعر دیئے ہیں۔ کہیں کہیں اپنے بھی شعر بطور سند پیش کیئے ہیں سندی اشعار میں سب سے زیادہ تعداد میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا کے اشعار کی ہے۔ مولف نے سندی اشعار پیش کرنے میں اس تنگ نظری سے کام نہیں لیا جس سے بعض اردو کے نادان دوست اردو کو صرف دلی اور لکھنو کی چار دیواری تک محدود کر کے بات بات پر زبان پکڑنی چاہتے ہیں۔ مولف کا مولد و منشا شاہ جہاں آباد ہونے کے باوجود اس نے نہایت آزاد خیالی اور وسیع النظری کے ساتھ اردو کی فطری آزادی کو پیش نظر رکھ کر دکھنی شعراء کے کلام سے بھی استناد کیا ہے ان میں سے چند قدیم دکھنی شاعر جن کے اشعار سنداً پیش کیے گئے ہیں۔ معتبر خاں عمر اورنگ آبادی ولی اورنگ آبادی۔ سراج، شاہ عزیز، سید عبد الولی عزلت اور سید عبد اللہ تجرد ہیں۔ محاوروں کی تشریح اس طرح کی ہے۔

(۱) انگاروں پر لوٹنا۔ کنایہ از بیقراری کہ در عالم رشک لاحق گردد۔ ولی دکنی گوید

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں تب سے انگاروں پہ لوٹے ہے ولی

(۲) رفو چکر میں آنا۔ حیران ماندن بہ مشاہدۂ امر عجیب وعوام بازاری استعمال کنند۔ سراج الدین سراج دکھنی گوید ؎

رفوگر کو کہاں طاقت کہ زخم عشق کو ٹانکے ۔۔۔ اگر دیکھے مرا سینہ رفو چکر میں آجاوے

(۳) لونی۔ بہ واؤ مجہول بیائے معروف کنایہ از شورہ بستن دیوار است کہ در ایام برسات بر دیوار گلی عارض گردد۔ شاہ عزیز اللہ عزیز دکھنی گوید ؎

کان نمک ہوا ہوں ترا حسن سنہ دیکھ ۔۔۔ لونی برہ کی جب سے لگی گل گیا ہوں میں

بہار دانش | طپش نے میر حسن کی سحر البیان کے طرز پر ایک طویل مثنوی "بہار دانش" کے نام سے لکھی ہے اس میں جہاندار شاہ اور بہرہ ور بانو کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی ہے۔ یہ طپش کا شاہکار ہے اور اس میں انہوں نے اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا ہے۔ محاسن ظاہری اور انداز بیان میں بالکل میر حسن کی تقلید کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن کی مثنوی کو بہت جلد مقبولیت عامہ حاصل ہو چکی تھی اور لوگ اس کی تقلید میں مثنویاں لکھنے لگے تھے۔ اس مثنوی میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ ابتداً شیخ عنایت اللہ بنگالی نے فارسی نثر میں لکھا تھا اور وہ خوب مشہور ہو چکا تھا۔ طپش نے جیسا کہ ان کے ابتدائی اشعار سے معلوم ہوتا ہے بقائے اسم و شہرت عام کے خیال سے اسی فارسی قصہ کو اردو میں نظم کیا ہے۔ شروع میں حمد و نعت کے بعد صاحبان عالیشان گورنر بنگال اور اراکین کونسل ایسٹ انڈیا کمپنی کی تعریف اور افادات کالج کے عنوان سے فورٹ ولیم کالج اور اس کے پرنسپل اور معتمد کا تذکرہ کیا ہے۔

پھر اصل داستان شروع کی ہے جو قدیم مطبوعات کالج کی طرح ٹائپ کے حروف کے (۲۷۰) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۶ھ م ۱۸۰۹ء ہے اور اختتام داستان پر طپش نے خود نظم میں اس طرح بیان کی ہے۔

ہوا جس گھڑی ترجمہ یہ تمام ۔۔۔ بہ طرز لطیف و بہ حسن کلام
طپش نے وہیں فکر کر ایک بار ۔۔۔ کہی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس سال کی تین مولفات (۱) باغ و بہار میرامن (۲) نو طرز مرصع عوض زرین (۳) بہار دانش کی تاریخ اس ماده سے نکلی ہے۔ میرامن نے توہم نام وہم تاریخ کہکر اپنی کتاب کو اسی مادہ تاریخ سے موسوم کر دیا۔

بہار دانش سب سے پہلے ۱۸۲۵ء میں کلکتہ کے محمدی پریس میں طبع ہوئی۔ اس ایڈیشن کے نسخے آج کل بہت ہی نایاب ہیں کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں ایک نسخہ نظر سے گذرا جو کسی قدر کرم خوردہ ہے۔ ہمارے پیش نظر ایک اور نسخہ بمبئی کا مطبوعہ ہے اس کا سنہ طباعت ۱۳۱۲ھ ہے لکھنو سے بھی ایک ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں شایع ہوا تھا آج کل اس کے نسخے بہت مشکل سے دستیاب ہو سکتے ہیں مؤلف خمخانۂ جاوید کا بیان ہے کہ بہار دانش کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے مگر ہم کو معلوم نہ ہوسکا کہ یہ ترجمہ کس نے کیا اور کہاں سے شایع ہوا۔

مثنوی میں شاعر نہایت آزادی کے ساتھ جذبات و احساسات کے ساتھ واقعات و مناظر بھی بہ احسن الوجوہ پیش کرسکتا ہے اور مثنوی کی

خوبی بھی ان دونوں بیانات کے بہترین ہونے پر منحصر ہے۔ میر حسن کی مثنوی کو جو قبولیت حاصل ہے اس کا راز اسی میں پنہاں ہے۔ طپش نے بھی کوشش کی ہے کہ جذبات کی محاکات و کیفیات و مناظر کو بہتر پیرایہ میں پیش کریں۔ ہماری ذاتی رائے ہے کہ وقائع نگاری کے لحاظ سے انکے بیانات نہایت عمدہ ہیں۔ یہ موقع تفصیل کے ساتھ تخلیقی تنقید کا نہیں نمونہ کلام پیش ہے۔

سنو اگے کم اب ادھر کا بیاں　　پدر مہر بانو کا ہو شادماں
اہالی موالی سے اپنے کہا　　کہ نقار خانہ میں دو حکم جا
کہ نوبت دھریں آج سی بیاہ کی　　کہ شادی ہے اس غیرت ماہ کی
محل میں بھی ہیں گائنیں جو تمام　　مچادیں بدھاوے کی اب دھوم دھام
کرو شہر کو یکسر آئینہ بند　　کہ دے روشنی لطف جس سے دوچند
امیروں کو تورے بٹے رنگ برنگ　　شتابی کرو بس نہ ہووے درنگ
زری بادلے کے بچھیں فرش سب　　تکلف کے خلعت ہوں تیار اب
صندوقچے جواہر کے بھی وا کرو　　جو مطلوب ہے سب مہیا کرو
جب ارکان دولت یہ لائے بجا　　اور اسباب سب کچھ مہیا کیا
تو بھیجا ملک زادہ کو پھر پیام　　کہ اے شاہ فرخندہ والا مقام
معین ہے اب ساعت سعد کل　　بس اب کل کرو روشن آکر محل
جلوس تزک کا جو سامان تھا　　وہ سب کچھ ادھر سے روانہ کیا
ملک زادہ بس وقت موعود پر　　رفیقوں کے تئیں اپنے سب جمع کر

براتی ہر اک کو بخوبی بنا — بنا آپ دولھا بہ ناز و ادا

گیا دھوم سے اور بڑے اوج سی — اُسی لاؤ لشکر اُسی فوج سی

اُٹھے بہر تعظیم امیر و وزیر — گئے آگے لینے صغیر و کبیر

لگی تھی جہاں مسندِ زر نگار — بٹھایا وہاں لاکے با اقتدار

طوائف جو تھیں پھر رہیں ناز سے — لگیں ناچنے اٹھکے انداز سے

گھڑی چار باقی رہی جبکہ رات — تو..... کو پڑھ مہربانو کے سات

گئے فوج لے کر محل میں شتاب — وہاں کی کہوں آگے کیا آب و تاب

بصد عزم مسند پہ رکھا قدم — ہوا بر طرف دل سے اندوہ و غم

چھپی ہوئی بلائیں کہیں لیتی ساس — کہیں سمدھنیں پھر رہیں آس پاس

کسی طرف کو گاینوں کا ہجوم — کسی طرف ٹوٹے سلونے کی دھوم

دلہن کو بٹھایا جو پھر لاکے پاس — عجب طرح کی مہکی اسوقت باس

کہ صدقہ ہو اس پہ سے صد بوئے گل — کہاں گل نے پائی یہ بو باس گل؎

پھر اس میں جو شہربت کا چرچا ہوا — مزہ اور ہی کچھ دو بالا ہوا

پڑے پھیر گلے میں جو پھولوں کے ہار — مبارک سلامت مچی ایک بار

گھڑی ایک دو جب رہی باقی رات — تو رخصت کی پھر آن کر ٹھہری بات

اٹھا گود میں اپنی دلہن کو ہنس — ملک زادہ نکلا محل سے وہیں

بجاتا ہوا نوبتیں شان سے — رہا پھر اسی باغ میں آن کے

؎ قافیہ ؟

یوسف زلیخا | کہا جاتا ہے کہ طپش نے فارسی کے مشہور قصہ یوسف زلیخا کو بھی اردو میں نظم کیا ہے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ کب لکھا۔ ہمیں اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہیں ہوا۔ یورپ کے مشہور مشرقی کتب خانوں میں بھی اس کا کوئی نسخہ نہیں ہے اور ہم تحقیق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ طپش نے یہ قصہ بھی نظم کیا ہے۔

مرزا کاظم علی جوانؔ

مرزا کاظم علی المتخلص بہ جوانؔ بھی فورٹ ولیم کالج کے مشہور منشیوں میں ہیں وہ دہلی کے باشندے تھے۔ ان کے آباؤ اجداد اور خاندانی حالات کا کچھ علم نہیں۔ دہلی کی تباہی کے بعد اور شرفا و نجبا کی طرح یہ بھی آوارہ وطن ہوئے اور ایک زمانہ تک مختلف مقامات پر تلاش معاش کرتے ہوئے بالآخر لکھنؤ میں جہاں شعراء اور ادیبوں کی اچھی قدردانی تھی، جا پہنچے وہاں مشاعروں میں غزلیں پڑھنے اور داد تحسین حاصل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ مشہور شعراء میں شمار ہونے لگا۔ نواب علی ابراہیم خاں خلیلؔ نے اپنے تذکرہ گلزارِ ابراہیم مولفہ ۱۱۹۶ھ میں لکھا ہے کہ کاظم علی ان دنوں لکھنؤ میں رہتے تھے اور اپنی غزلیں اور دیگر اقسام کے نمونے انکے پاس بھیجے تھے غالباً یہ ان کے تذکرہ کے لیے اپنا نمونہ کلام بھیجا ہوگا۔ منشی کریم الدین مولف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے ۱۱۹۶ھ میں انہیں لکھنؤ میں دیکھا ہے کاظم علی عربی فارسی کے علاوہ برج بھاشا میں بھی کافی دستگاہ رکھتے تھے ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ شاعری میں انہیں کس سے تلمذ حاصل تھا۔

کرنل اسکاٹ ریزیڈنٹ لکھنؤ نے جو کاظم علی کے تبحر علمی سے واقف تھے ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کی مدرسی کے لیے ان کی سفارش کی اور ان کو بھی میر شیر علی افسوسؔ کی طرح وہاں ملازم کروادیا۔ کالج سے تعلق پیدا ہونے کے بعد

کاظم علی نے کلکتہ میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی اور یہیں کے ہو رہے اور غالباً وہیں انتقال کیا ہوگا ان کا سن وفات تو معلوم نہیں مگر منشی بینی نارائن جہان نے دیوان جہان میں جو ۱۸۱۴ء م ۱۲۲۷ھ میں تالیف ہوا ہے ان کو بقید حیات بتایا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸۱۵ء میں انہوں نے شیخ حفیظ الدین کی خرد افروز کی نظر ثانی کی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک وہ نہ صرف بقید حیات تھے بلکہ تصنیف و تالیف کا کام بھی انجام دینے کے قابل تھے ان کے دو بیٹے بھی اپنے باپ کی طرح اچھے عالم اور کلکتہ کے مشہور شاعر تھے یہ تینوں باپ بیٹے کلکتہ میں شعر و شاعری کا بازار گرم رکھتے تھے اور اکثر مشاعرے منعقد کرکے اپنا کلام سناتے اور دوسرے شعراء کو بھی اپنے افکار طبع کے اظہار کا موقع دیتے تھے۔ ان کے بیٹوں کے نام دیوان جہان میں مرزا قاسم علی ممتاز اور مرزا ہاشم علی عیاں لکھے ہیں خود فورٹ ولیم کالج کی طرف سے ہر سال غالباً ۲۵ جولائی کو نہایت اہتمام کے ساتھ مشاعرہ منعقد کیا جاتا تھا۔ وہاں کے تقریباً تمام شعراء اس میں حصہ لیتے تھے۔ ۱۸۱۵ء کے ایک ایسے مشاعرے کی غزلیں دیوانِ جہان میں بطور ضمیمہ مندرج ہیں اور ان میں جواں اور ان کے دونوں بیٹوں ممتاز و عیاں کی غزلیں بھی ہیں۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ مولف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا حال تو بیان کیا ہے مگر اشعار نہیں دیے اور صرف یہ لکھدیا ہے کہ اغلب ہے کہ جواں کا دیوان بھی مرتب ہوا ہو۔ دیوان بالکل لاپتہ ہے اور ممکن ہے کہ وہ مرتب ہی نہ ہوا ہو یا مسودہ کی صورت ہی میں دست برد

زمانہ کی نذر ہو گیا ہو۔ کیونکہ مولف گلشن ہند مرزا علی لطف نے ان کا ذکر اپنے تذکرہ کی جلد اول میں نہیں کیا اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے اس میں صاحب دیوان شعرار کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اگر جوان کا دیوان ۱۸۰۱ء تک مرتب ہو گیا ہوتا تو شبیر علی افسوس کی طرح ان کا ذکر بھی اس تذکرہ میں کیا جاتا۔ بہر حال دیوان کا کچھ حال معلوم نہیں البتہ دوسری تالیفات کے قلمی نسخے یورپ کے مشہور کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں

سکنتلا ناٹک کاظم علی نے غالباً آخری عمر تک تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا اور کئی کتابیں لکھیں ان کی پہلی کتاب "سکنتلا ناٹک" ہے۔ کالج کی ملازمت میں داخل ہو کر انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ۱۸۰۱ء میں ہندی کے مشہور ڈراما سکنتلا کو اسی نام سے اردو میں ترجمہ کیا مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ۱۸۰۲ء میں گل کرسٹ کے "بیاض ہندی" میں اس کا ایک طویل اقتباس شائع ہوا۔ اس کی پہلی اشاعت ۱۸۲۶ء میں ہوئی۔ اور اس وقت جوان نے اس کی نظر ثانی کر کے تھوڑا سا اضافہ کر دیا۔ چنانچہ اس دیباچہ میں اپنا حال اور سکنتلا کے ترجمہ کرنے کا ذکر اس طرح بیان کیا ہے۔

کرنل اسکاٹ صاحب جو لکھنو کے بڑے صاحب ہیں انہوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہ کے ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرما کر اشرف البلاد

کلکتہ کو روانہ کیا۔ ان میں احقر بھی یہاں وارد ہو اور موافق حکم حضور خدمت میں مدرس مدرسہ ہندی کی جو صاحب والامناقب جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں شرف اندوز ہوا۔ دوسرے ہی دن انہوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتولا کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کر اور للولال جی کب کو حکم کیا کہ بلاناغہ لکھا یا کرے اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی۔ لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا کہ جس نے سنا پسند کیا اور اچھا کہا بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔ ان دنوں میں کہ سنہ ۱۸۱۲ء ہیں۔ اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمہ کا محاورہ درست کرتا ہے۔ صاحب ممدوح نے فرمایا کہ تم بھی اس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو نہ رہے چنانچہ ہم ان کا فرمانا بجالائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔

یہ ڈراما اصل میں سنسکرت میں تھا اور اس کا مصنف سنسکرت کا مشہور و مقبول شاعر کالیداس ہے اور اس کی شہرت و مقبولیت کا باعث بھی اس کا یہی کارنامہ ہے۔ ہندی میں اس کے متعدد ترجمے ہوئے۔ کاظم علی نے نواز کبیسور کے ہندی ترجمہ سے اپنا اردو ترجمہ مرتب کیا ہے اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ نواز کبیسور نے فرخ سیر بادشاہ (۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ) کے ایک فوجی سردار مولے خاں ولد خدائی خاں کے حکم سے لکھا ہے اور مولے خاں

نے جس کو جنگی کارگزاری اور ایک لڑائی جیتنے کے صلہ میں عظیم خاں کا خطاب ملا تھا اپنے خطاب پانے کی یادگار میں یہ ترجمہ کروایا ہے۔ نواز کا مرتبہ نسخہ کبت اور دوہروں میں تھا اور اردو میں اس کا ہو بہو ترجمہ ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ کاظم علی نے اس کی مشکلات کا اظہار کرتے ہوئے جیسا کہ مولف طبقات الشعرا ہند نے لکھا ہے، مہابھارت کے انداز میں ترجمہ کیا سارا قصہ نثر میں ہے اور جابجا دوہروں اور کبت کے معاوضہ میں اپنے اشعار لکھ دیے ہیں جس سے قصہ میں جان پڑ گئی اور نفس مضمون کا لطف دو بالا ہو گیا۔

اردو لٹریچر حال تک ڈراما کے عنصر سے بالکل خالی تھا اب مغربی زبانوں اور بالخصوص انگریزی کے اثر سے چند عمدہ ڈرامے تصنیف اور ترجمہ ہوئے ہیں مگر اس صنف کو ابھی اتنی ترقی نہیں ہوئی کہ یہ ہماری ادبیات کا ایک اہم حصہ قرار دیا جا سکے۔ تاہم جو کچھ بھی ہوا ہے وہ غنیمت ہے اور حالات و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چند روز میں اردو اس ضروری صنف ادب سے کافی مالامال ہو جائے گی۔ بہرحال کاظم علی کو اس خصوص میں دوسرے ڈراما نویسوں پر ایک قسم کا تقدم حاصل ہے۔ انہوں نے اس کے ذریعہ اردو کو پہلی مرتبہ ڈراما سے روشناس کرایا جس طرح فورٹ ولیم کالج کی کتابوں کی تقلید میں اردو میں نثر نویسی کا عام شوق پیدا ہو گیا۔ اس طرف بھی توجہ کیجاتی تو اب تک اردو میں بیسیوں عمدہ ڈرامے موجود ہو جاتے سکنتلا ناٹک کے بہت کم ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ غالباً اس کا دوسرا ایڈیشن وہی ہے جو ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی کتاب مکالمات کے ساتھ بطور ضمیمہ

۱۸۲۶ء میں لندن سے شائع کیا تھا۔ تیسرا ایڈیشن بمبئی سے بہمن جی دوسا جی نے ۱۸۴۸ء میں شائع کیا اور پھر ۱۸۷۵ء میں لکھنؤ سے ایک ایڈیشن نکلا۔ آج کل اس کے نسخے بالکل کمیاب ہیں۔ ہمیں اپنے ایک عنایت فرما بزرگ مولوی ابو محمد صاحب بلگرامی کے کتب خانہ "سید علی حسن میموریل لائبریری" میں اس کا ایک نسخہ تیسرے ایڈیشن کا دستیاب ہوا ہے۔ ذیل میں اس کا اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔

"اگلے زمانہ میں دسوامتر نام ایک شخص تھا۔ شہر کو چھوڑ کر جنگل میں رہا کرتا اور اپنے طور کی عبادت و ریاضت دن رات کیا کرتا۔ اپنے صاحب کی بندگی میں تن بدن کی کچھ اسے خبر نہ تھی، سوا اسی کے تصور کے کبھی نگاہ ادھر اُدھر نہ تھی یہاں تک کہ دُبلاپے سے لٹا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا ؎

بدن سوکھ کر اس کا کانٹا ہوا تھا   ریاضت کے مارے وہ جیتا موا تھا

ان دکھوں سے اس کو کبھی ایک دم آرام نہ تھا۔ سوا اٹھانے ان جفاؤں کے کچھ کام نہ تھا تاکہ اس خاکساری سے آرزو دل کی بر آوے اور درخت سے مدعا کے پھل پاوے۔ ایسا جوگ کیا۔ ایسا آسن بیٹھا۔ نزدیک تھا کہ بندگی کے زور سے راجہ اندر کی سنگھاسن چھین لے۔ جتنے تیرتھ تھے ان سب میں گیا۔ شہر شہر دریا دریا گھاٹ گھاٹ پیکرا کرتا پھرا، نہ چھوڑا کسی ندی کا کنارہ۔ جس جنگل میں کسی درخت تلے ذرا بیٹھتا گرداگرد آگ جلاتا۔ پھر اپنے تئیں الٹا لٹکا۔ دم بدم

دھواں منہ میں لیا کرتا۔ تپشیا اس طرح کیا کرتا غرض اس
تپشیوں کا یہی حال تھا۔ آٹھوں پہر تپ جپ کا خیال تھا۔ چونسٹھ
برس تلک وہ بیاباں نورد تھا۔ سر سے لگا کر پاؤں تلک
گرد گرد تھا۔ بناس پتی کھاتا رہتا۔ بھوک پیاس کی ایذائیں
سہتا اور رُو بہ آفتاب ہو کر

گرمیوں میں وہ جگر تفتہ جلا کر گرد آگ ۔ بیٹھتا تھا ڈھیر جیسے راکھ کا آوے نظر
اور جاڑوں میں گلے تک پانی میں کھڑا ۔ جپ کیا کرتا تھا شوق دل سے ہر شام و سحر

ایسی باتیں سنکر راجہ کو بہت سوچ پڑا ڈر دل میں ہوا۔ اس کے
اس جوگ کو توڑنے کے لیے منو کا پری کو بلا کر بہت سی آدبھگت کی
اور یہ احوال ظاہر کیا۔ وہ راجہ کے حسن سلوک سے بہت خوش ہوئی
اور اس مطلب کے سنتے ہی یوں بولی کہ میں وہ پری ہوں کہ اگر میرا
سایہ برھما بشنو مہادیو پر پڑے دیوانے ہو جائیں

جو وے ہوویں وحشی تو کروں میں رام ۔ میری یاد میں بھولیں سب اپنے کام
یہ ایسی ہیں جادو بھری انکھڑیاں ۔ رہے دیکھ کر ان کو سدھ بدھ کہاں
یہ احوال جب ایسے لوگوں کا ہو ۔ رکھوں پاک دامن میں کب اور کو

دسواستر کو ایک پل میں اپنے پر دیوانہ کروں۔ تمام عمر قشقہ کی جا کہہ
یہ کلنک کا ٹیکہ ماتھے پر دھروں۔ جوگی یا جتی تین الوک میں کون
ایسا ہے جو مجھ سے آپ کو بچاوے اس کو تو میں ایک دم میں
اور کا کچھ اور کر دوں۔ قسم ہے مہاراج کی اگر اسے کام کے بس کر

انگلیوں پر نہ نچاؤں تو اپنا نام منو کا نہ رکھواؤں۔ وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا تس پر سولہ سنگار بارہ ابھرن جو اس نے سر سے پاؤں تک کیے۔ دن کو تو سورج اس کا جلوہ دیکھ کر رشک کی آگ سے جلا اور رات کو چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا۔

شکنتلا کی مثال ایک سدا بہار پھول کی ہے جس کی خوشبو کو کبھی زوال نہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے۔ کالیداس اس کے مصنف اور خود مرزا کاظم علی جوان اس کے مترجم کی شہرت بھی اسی کی بدولت ہے کاظم علی کی زبان سلیس اور صاف ہے لیکن عبارت مقفیٰ ہے جس سے تکلف پیدا ہو گیا ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہونے کی وجہ سے مقفیٰ عبارت کا عیب کسی قدر چھپ جاتا ہے اور لطف کے تذکرہ گلشن ہند کی عبارتوں میں جو تعقید اور تکلف نمایاں طور پر نظر آتا ہے وہ اس میں نہیں ہے۔ مترجم نے جابجا اپنے اشعار سے کتاب کا لطف بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کی شاعری معمولی درجہ کی ہے مگر بعض جگہ واقعی ان کے اشعار برمحل اور پر لطف ہیں اور بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبردستی ٹھوس ٹھانس دیے ہیں اور اس سے اصل عبارت کی حسن و خوبی میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا ہندی کے الفاظ کا استعمال بھی بڑی فراخ دلی سے کیا ہے مگر وہ ایک حد تک اس میں معذور ہیں چونکہ وہ ہندی زبان کی کتاب کا ترجمہ کر رہے ہیں اور کتاب بھی ایسی جس میں ہندی ادبیات کی تلمیحیں اور

ہندوانی رسومات وعقائد وغیرہ کا بیان ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ کا ہندی الفاظ سے بالکل خالی ہونا سخت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تاہم کاظم علی نے اس کے استعمال میں بہت کچھ احتیاط سے کام لیا ہے اور مظہر علی ولا کی بیتال پچیسی کی طرح جا و بے جا ہندی الفاظ کی بھرمار سے احتراز کیا ہے۔ ان کی سلاست روی سے کتاب کا حسن دوبالا ہو گیا ہے اور ہندی الفاظ اکثر و بیشتر موقعوں پر اپنی جگہ نہایت برمحل اور مستحسن نظر آتے ہیں۔

جیسا کہ کاظم علی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ میں للولال کوی نے ان کی مدد کی ہے اور نواز کبیشور کے دوہرے اور کبت ان کو تفہیم کراتے گئے ہیں۔ شکنتلا کے قصہ کو اردو میں اور بھی لوگوں نے منتقل کر لیا تھا، ان میں سے دو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک سید محمد تقی ہیں جنہوں نے "رشک گلزار" کے نام سے قصہ کو اردو فارسی کی مشہور عشقیہ مثنویوں کی طرز پر نظم کیا ہے۔ دوسرا ترجمہ منشی اقبال ورما سحر نے حال ہی میں زمانہ پریس کانپور سے شایع کیا ہے اس کا نام "مثنوی سحر" ہے۔ اور یہ مثنوی "گلزار نسیم" کے تتبع میں لکھی گئی ہے۔ گلزار نسیم کی طرح اس میں بھی بے حد اختصار و ایجاز سے کام لیا گیا ہے جس وجہ سے ہندی قصہ کی اصلیت برقرار نہ رہ سکی۔ "رشک گلزار" میں بھی اختصار ہے مگر "مثنوی سحر" سے کم۔ اقبال ورما اردو کے اچھے اور مشاق شاعر ہیں۔ اپنی قدرت سخن سے کام لے کر اختصار کے باوجود کلام میں تعقید نہ ہونے دی اور نہ زبان کے روزمرہ ومحاورہ سے دور جا پڑے۔ انگریزی زبان میں بھی شکنتلا کے

کئی ترجمے شایع ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک تو مشہور مستشرق سر ولیم جونس متوفی نے اصل سنسکرت سے ترجمہ کیا ہے اور کاظم علی جوان نے اس کا ذکر کرکے بطور اعتذار یہ لکھا ہے کہ چونکہ انگریزی ترجمہ سنسکرت سے ہوا ہے اور میرا ترجمہ نواز کبیشور کے ہندی ترجمہ سے اس لیے اگر ان دونوں میں کچھ فرق ہو تو ممکن ہے۔

بارہ ماسہ کاظم علی کا دوسرا کارنامہ "بارہ ماسہ" یا "دستورِ ہند" ہے یہ ایک طویل نظم ہے جس میں ہندو مسلمانوں کے تمام تیوہاروں اور عیدوں کی جزئیات کو بالتفصیل مثنوی کے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بارہ حصے ہیں اور ہر حصہ میں ایک مہینے کے تمام مروجہ ہندوانی اور اسلامی تیوہاروں کا ذکر ہے اس لیے اس کا ہندی نام "بارہ ماسہ" رکھا گیا ہے تمہید کے بعد ۱۸۰۰ء کے مشہور قران شمس و قمر کو بھی بیان کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو علم نجوم میں بھی دخل تھا۔ یہ منظوم رسالہ ۱۸۰۲ء میں تصنیف ہوا اور ۱۸۱۲ء میں کلکتہ سے شایع کیا گیا۔ ہم کو جوان کے بارہ ماسہ کا کوئی نسخہ نہ مل سکا۔ البتہ تین مختلف لوگوں کے بارہ ماسے دستیاب ہوئے ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی شعرا نے قصیدہ، غزل وغیرہ کی طرح ایک صنف شاعری بنا لیا تھا۔ اور تفنن طبع کے طور پر کچھ نہ کچھ کہہ کر بارہ ماسہ لکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

"بارہ ماسہ" کی تصنیف کے بعد جوان ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے قرآن مجید کے ترجمہ کے کام میں لگ گئے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے بھی چند پاروں کا ترجمہ کیا ہو مگر نہ تو ان کے ترجمہ شدہ پارے موجود ہیں

اور نہ کسی بیان سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ انہوں نے کتنا ترجمہ کیا۔ شکنتلا کے دیباچہ کی جو عبارت ہم نے اوپر نقل کی ہے۔ اس میں جوان لکھتے ہیں کہ وہ ۱۸۰۳ء میں قرآن شریف کے ترجمہ کا محاورہ درست کرتے تھے۔ اسی سال ڈاکٹر گل کرسٹ انگلستان چلے گئے اور ان کے علیحدہ ہوتے ہی ان کے جانشینوں نے اس کام کو سرے سے موقوف ہی کر دیا اور جو کچھ ترجمہ ہوا تھا اس کی بھی اشاعت نہ ہوسکی۔ البتہ خوش قسمتی سے مولوی امانت نے جو حصہ ترجمہ کیا تھا وہ کسی اور شخص کی سعی سے شایع ہوچکا ہے اور اس کا ایک نسخہ بمبئی میں محفوظ بھی ہے۔ غرض یہ بتانا مشکل ہے کہ جوان نے کچھ ترجمہ بھی کیا ہے یا صرف دوسروں کے ترجموں کی نظر ثانی اور محاورے درست کرنے کا کام انجام دیتے رہے۔

تاریخ فرشتہ اس کے علاوہ جوان نے ۱۸۰۹ء میں تاریخ فرشتہ کے ایک بڑے حصہ کا بھی جو سلاطین بہمنیہ کے متعلق ہے ترجمہ کیا تھا معلوم نہیں کہ یہ شایع ہوا یا نہیں۔ فرشتہ کے مروجہ اردو ترجمے دوسرے اشخاص کے ہیں۔ جوان نے اپنی تصنیف و تالیف کے علاوہ شعرائے اُردو کے کلام کا انتخاب بھی کیا ہے اور اپنے دیگر معاصرین کی تالیفات میں بھی مدد دی ہے اس کی اجمالی کیفیت حسب ذیل ہے:-

کالج کی جانب سے ولی۔ میر۔ سودا اور سوز کے دواوین کے انتخاب شایع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے کلیات میر کا انتخاب مرزا کاظم علی نے مولوی محمد اسلم[1]، منشی غلام قادر اور مرزا جان طپش کے اشتراک عمل سے مرتب

---

[1] مولوی امانت اللہ کے حالات میں اس کا نمونہ دیا جاچکا ہے۔

کیا۔ نیز کلیات سودا کا انتخاب بھی کاظم علی اور شیر علی نے کیا ہے۔ یہ دونوں انتخابات شایع ہو چکے ہیں اول الذکر کا سنہ طباعت ۱۸۱۱ء اور آخرالذکر کا ۱۸۱۰ء ہے ہمارے پاس یہ دونوں کتابیں ہندوستانی پریس کلکتہ کی مطبوعہ ٹائپ کے حروف میں موجود ہیں۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کرنے والوں نے نہایت سلیقہ مندی سے کام لیا ہے اور میر وسودا کے ضخیم کلیات کا ایسا اچھا انتخاب کیا ہے جو ان کے سارے کلام کا نچوڑ ہے اور جس کے مطالعہ سے حشو و زوائد میں تضیع اوقات کے بغیر ان دونوں شاعروں کے کلام کے روح رواں کو آسانی سے سمجھ لیا جا سکتا ہے۔

۱۸۰۵ء میں جوآن نے سری للولال کوی کو مندر کبیسور کی کتاب سنگھاسن بتیسی کے ترجمہ میں مدد دی۔ للولال کوی بھی فورٹ ولیم کالج میں برج بھاشا کے مترجم تھے ان کا حال ہم نے علیحدہ عنوان سے لکھا ہے۔ سنگھاسن بتیسی میں ہندوؤں کے مشہور راجہ بکرماجیت کے بتیس سبق آموز اور نتیجہ خیز قصے بیان کیے گئے ہیں اس کا تفصیلی ذکر بھی للولال کے سلسلہ میں بیان ہوا ہے۔ جوآن نے ۱۸۱۵ء میں کپتان ٹامس روبک کے ایما سے مولوی حفیظ الدین کی کتاب "خرد افروز" کی بھی نظر ثانی کی تھی اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سی کتابوں کی ترتیب و اشاعت میں حصہ لیا ہے۔

شیخ حفیظ الدین احمد

شیخ حفیظ الدین احمد بھی فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم میں بہت مشہور ہیں
لیکن ان کے حالات پر مشہور تذکرہ نویسوں نے کچھ بھی نہیں لکھا خوش قسمتی
سے خود انہوں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں مختصراً اپنا ذکر کیا ہے اور منشی
کریم الدین مؤلف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے اس کو نقل کر لیا ہے علاوہ ازیں
ان کی کتاب کا جو نسخہ ہماری نظر سے گذرا ہے اس کے مرتب ناشر نے بھی ایک
کام کی بات بیان کی ہے ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حفیظ الدین کے
ایک جد اعلیٰ عرب سے ترک وطن کر کے دکن آئے اور وہاں بود و باش اختیار
کی۔ دو تین پشتوں کے بعد ان کے پردادا شیخ حسن دکن سے نکل کر بنگال
میں سکونت پذیر ہوئے ان کا خاندان کئی پشت تک فقر و قناعت کی زندگی
بسر کرتا رہا اور کئی بزرگ صاحب رشد و ہدایت گذرے ان میں سے ایک
شیخ سعدی عرف شاہ پیراں قدس سرہٗ تھے جو شاہ عنایت اللہ صاحب کے
مرید اور تربیت یافتہ تھے شاہ عنایت اللہ صاحب حضرت شاہ عبداللہ صاحب
کرمانی نامی بزرگ کی اولاد میں اور بڑے زاہد و مرتاض بزرگ تھے حفیظ الدین
کے آباو اجداد میں ان کے والد شیخ جلال الدین محمد ابن شیخ محمد ذاکر صدیقی نے
پیشۂ ملازمت اختیار کیا اور کلکتہ کے مدرسہ میں جو وارن ہسٹنگز گورنر جنرل
اول نے قایم کیا تھا اور جو اس زمانہ میں نیٹو کالج کے نام سے موسوم تھا مدرس ہوئے

وہ عربی فارسی کے اچھے عالم تھے۔ حفیظ الدین نے اپنے والد ہی کے دامن تربیت میں رہ کر اس مدرسہ میں عربی فارسی کی تحصیل کی۔ اور بیس سال کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت حاصل کر کے روزگار کی تلاش کرنے لگے۔ اسی زمانہ میں لارڈ ویلزلی گورنر جنرل نے فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو ان کی اعلیٰ عربی فارسی قابلیت کے مدنظر عربی و فارسی کا استاد مقرر کیا اور وہ اس خدمت کو بہ حسن و خوبی انجام دینے لگے۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ نے ان سے تدریس و تعلیم کے علاوہ ترجمہ کا کام بھی لینا چاہا اور عیار دانش کے اردو میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی۔ مولوی عبدالحق صاحب[1] اور مولف سیر المصنفین[2] نے لکھا ہے کہ رزیڈنٹ دہلی کے منشی تھے بعد میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہو گئے اور اس بنا پر ان دونوں نے حفیظ الدین کو دہلوی بتایا ہے مگر خود حفیظ الدین اور ان کے معاصر تذکرہ نویس کے بیانات سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں مولف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے کہ اس نے ۱۸۱۵ء میں حفیظ الدین کو دہلی میں دیکھا ہے اس کی مزید تقویت ای الیسٹ ویک کے بھی بیان سے ہوتی ہے جس نے صاف طور پر بتا دیا ہے کہ حفیظ الدین فورٹ ولیم کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر مسٹر مٹکاف رزیڈنٹ دہلی کے منشی مقرر ہو گئے اور ۱۸۱۵ء میں دہلی میں تھے۔ یہ بیانات خود صاحب تصنیف اور معاصرین کے ہیں جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں شیخ حفیظ الدین شاعر

---

[1] رسالہ اردو ۱۹۲۵ء ص ۴۹۶ [2] سیر المصنفین ص ۷۹

بھی تھے اور احمد تخلص کرتے تھے جیسا کہ مولف طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے مگر
اس نے ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا۔ غالباً ان کا کلام دست برد زمانہ سے
نہ بچ سکا اور اس کا بھی قوی امکان ہے کہ ان کی شاعری تفنن طبع کی خاطر
ہوتی ہوگی۔ اب ان کی شہرت صرف ترجمہ عیار دانش کی بدولت ہے۔

خرد افروز | اس کا نام "خرد افروز" ہے اور یہ ترجمہ ۱۸۰۳ء میں تمام ہوا
اس کے دیباچہ میں لکھا ہے "ایک دن قوانین ریختہ کے معلم اول ....
مدرس ہندی جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ ترجمہ عیار دانش
جو فی الحقیقت دانش کی کسوٹی اور آئین سلطنت کا دستور العمل ہے" حقیر نے
ان کا حکم بجا لا کر ترجمہ کرنے پر کمر باندھی۔ خدا کے فضل سے حسن انصرام کو پہنچا اور
نام اس کا "خرد افروز" رکھا۔

بعد اتمام کے تاریخ اس کی چاہا میں لکھوں لگا کر اپنا جی
آئی ہاتف سے ندا یوں فی الفور خرد افروز جہاں یہ ہے بکی [1]

مؤلف طبقات الشعرائے ہند کا بیان ہے کہ حفیظ الدین نے اس کام میں با
نہایت تن دہی سے توجہ کی اور اپنے فاضل والد کی امداد سے مئی ۱۸۰۳ء
میں ترجمہ تمام کر کے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ملاحظہ میں پیش کیا تو انہوں نے بجید
پسند کیا اور مترجم کو اس کی محنت کا کافی صلہ دلایا۔ چونکہ ترجمہ کی عبارت
صاف شستہ اور جیدہ و لطیف اور ترجمہ مطابق اصل کے ہے اس واسطے
اس کی بہت قدر کی گئی۔ مگر خود حفیظ الدین نے اپنے والد کی امداد کا

---

[1] خرد افروز مطبوعہ ہارٹ فورڈ ۱۸۵۷ء

ذکر نہیں کیا ہے۔

عیار دانش اصل میں کلیلہ دمنہ کا قصہ ہے جس کو فارسی میں متعدد لوگوں نے لکھا ہے زیادہ مشہور فارسی ترجمہ ملا حسین الواعظ کاشفی کا ہے جو انوار سہیلی کے نام سے مشہور ہے یہ قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ ابتداءً سنسکرت زبان میں تھا۔ ساسانی فرمارو ایان ایران کے عہد میں اس کا فارسی اور پھر عربی وغیرہ السنہ میں ترجمہ ہوا۔ علامہ ابوالفضل کی عیار دانش انوار سہیلی سے بلحاظ زبان وطرز بیان وقصہ کے بہت مختلف ہے انھوں نے یا تو سنسکرت یا قدیم فارسی ترجمہ کو پیش نظر رکھ کر اپنا ترجمہ مرتب کیا ہے۔ انوار سہیلی کی طرح اس کو بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مگر اردو میں غالباً اس کا یہی ایک ترجمہ "خرد افروز" ہوا ہے۔ البتہ انوار سہیلی کو کئی ایک آدمیوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں اس کے دکھنی ترجمے بھی ہیں مگر ان کے مترجم کا نام معلوم نہیں اور نہ یہ ٹھیک طور پر معلوم ہو سکا کہ وہ کس زمانہ کے ترجمے ہیں۔ فورٹ سنٹ جارج مدراس سے ایک ترجمہ ۱۸۴۴ء میں محمد ابراہیم بیجاپوری نے شایع کیا تھا اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے اور ایک نسخہ مولوی سید سجاد صاحب پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ کے پاس بھی ہماری نظر سے گذرا ہے۔ دوسرا مشہور ترجمہ فقیر محمد خاں گویا کا ہے جو "بستانِ حکمت" کے نام سے موسوم ہے اور ۱۲۵۱ھ میں مرتب ہوا ہے۔ یہی ترجمہ زیادہ مقبول ہے علاوہ ازیں مرزا مہدی نام ایک شخص نے جو کسی کپتان ڈگلس ناکس کے

میر منشی تھے اور گیا میں رہتے تھے اس کا اردو ترجمہ کیا ہے مگر یہ شایع نہیں ہوا' دوسرے دو ترجمے محمد علی خاں وحشی نے "ضیائے حکمت" کے نام سے ۱۸۷۲ء میں اور جان بہاری لال راضی نے ۱۸۸۵ء میں "ارژنگ راضی" کے نام سے شایع کیے ہیں ان میں سے آخر الذکر منظوم ہے۔ منشی کریم الدین نے اپنے تذکرہ میں ایک اور ترجمہ "منتخب الفوائد" نامی کا بھی ذکر کیا ہے۔

حفیظ الدین کا طرز بیان نہایت صاف و سلیس ہے اس میں شوخی و رنگینی مطلق نہیں۔ فصاحت کے ساتھ سنجیدگی پائی جاتی ہے ان کی نثر زمانہ غدر اور اس کے بعد کے قریبی زمانہ سے بہت ملتی جلتی ہے قواعد زبان اور روزمرہ کی پابندی کے ساتھ الفاظ کا استعمال بہت کچھ آزادی سے کیا گیا ہے۔ نہ ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور نہ فارسی عربی الفاظ کی بھرمار۔ دونوں کا نہایت ہی عمدہ میل ہے۔ سرسیدؒ کے اسلوب بیان کی جھلک پائی جاتی ہے۔ حالانکہ "خرد افروز" قصوں کی کتاب ہے مگر نفس مضمون کی سنجیدگی کا لحاظ کرتے ہوئے حفیظ الدین نے انشا پردازی کی بلند پروازیوں اور تشبیہ و استعارہ کے ہیر پھیر سے ہٹ کر نہایت ہی صفائی اور سادگی سے لکھا ہے۔ جس زمانہ میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت نثر میں شاعرانہ نزاکتیں اور تکلف کی آمیزش خاص کمال سمجھی جاتی تھی اور عام مذاق ایسی روکھی پھیکی کتابوں کو پسند نہیں کرتا تھا۔ تاہم خرد افروز کو بہت کچھ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابتداءً اس کا ایک حصہ دیگر مؤلفات

کی طرح ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی "بیاض ہندی" میں شامل و شایع کیا ہے۔ پھر پوری کتاب اہتمام کے ساتھ ۱۸۰۳ء میں شایع ہوئی۔ دوسرا اڈیشن کپتان ٹامس روبک کے اہتمام سے میر کاظم علی جوان، منشی غلام اکبر، مرزا جی بیگ اور منشی غلام قادر کی نظر ثانی و تصحیح کے بعد ۱۸۱۵ء میں شایع کیا گیا۔ اس وقت حفیظ الدین کالج کی ملازمت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ تیسرا اڈیشن بہت ہی اہتمام کے ساتھ ای ایسٹ وک نے ۱۸۶۷ء میں ہارٹ فورڈ (انگلستان) سے شایع کیا اس میں رسم الخط اور املا کا خاص اہتمام ہے۔ تشریح طلب باتوں کی انگریزی میں فٹ نوٹ کے ذریعہ وضاحت کر دی گئی ہے اس کا ایک نسخہ اسی سنہ کا چھپا ہوا کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ میاؤں نے خرد افروز کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔

خرد افروز میں مترجم نے "کیفیت" کے عنوان سے ایک طویل دیباچہ دیا ہے جس میں حمد و نعت کے بعد اپنا حال، ترجمہ کرنے کا سبب اور پھر اصل تصنیف کی کیفیت بالتفصیل بیان کی ہے۔ اس کے کل سولہ باب ہیں پہلے دو باب اصل پہلوی ترجمہ کے مترجم بزرجمہر کے متعلق تھے۔ جن کو انوار سہیلی کے مولف نے حذف کر دیا۔ مگر ابو الفضل نے بحال رکھا ہر باب کے آخر میں "باب کا خلاصہ" کے عنوان سے اس باب کے نفس مضمون اور ماحصل پر بصیرت افروز نظر ڈالی ہے کتاب کا نمونہ یہ ہے۔

حکایت۔ برہمن نے کہا۔ نقل ہے کہ روم کی سرحد میں ایک بادشاہ

عالی ہمت، بزرگ منش تھا اس کے دو بیٹے حسین و خوشخو تھے جب
بادشاہ نے عالم بقا کے کوچ کا نقارہ بجایا۔ بڑا بھائی دولت بادشاہی ہاتھ میں
لے کر چھوٹے بڑے سبھوں کے دل کو ہاتھ میں لایا اور باپ کے تخت
سلطنت پر بیٹھا اور خزانہ کا منہ کھول دیا۔ چھوٹے بھائی نے اس
ڈر سے کہ مبادا مجھ پر کچھ آفت لاوے وطن چھوڑ کر سفر را ختیار
کیا اور اکیلا راہ دور و دراز کو چلا۔ اتفاقاً ایک جوان نازنین خوبصورت
کہ جس نے زمانہ کی گردش سے سفر کیا تھا اس کے ہمراہ ہوا۔ شاہزادے
نے جو اس کے چہرہ سے راست بازی دریافت کی اسکی رفاقت سے
خوش ہوا دوسری منزل میں ایک دانا سوداگر بچہ ہوشیار کہ جس نے
گھر بار تج کر سفر کیا تھا ان کو ملا۔ تیسری منزل میں ایک زور آور دہقان
بچہ جو کسی باغبان دانا کے نطفہ سے تھا ان کا رفیق ہوا تمام اذیت
سفر کی راحت سے بدل ہوئی۔ چاروں دوست ایک دل خوشی سے منزل
طے کرتے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فارغ بال و آسودہ حال رہتے تھے
دور دراز منزل کو طے کر کے شہر نسطور میں پہنچے اور شہر کے ایک کنارے
اچھی جگہ اترے کسی کے پاس کچھ خرچ کو نہ رہا تھا۔ ان یاروں میں سے ایک نے
کہا اب وہ وقت ہے کہ ہر کوئی اپنا اپنا ہنر دکھلائے اور زور بازو سے
کچھ بہم پہنچاوے تو چین سے چند روز اس شہر میں رہیں بادشاہزادے
نے کہا۔ سب کام خدا کی تقدیر پر موقوف ہیں۔ آدمی کی کوشش سے
سرانجام نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ دانا ہیں اسکی تلاش میں نہیں دوڑتے

ہیں۔ خوبصورت جوان نے کہا۔ حسن و دولت کے حاصل کرنے میں بڑا ایک
وسیلہ ہے جہاں اس کی نمود ہو دولت تابع ہوگی۔ سوداگر بچہ نے
بھی حال اپنا ظاہر کرکے کہا کہ حسن کی پونجی معاملہ کے بازار میں ایک
نقد بے بہا ہے اور تھوڑے عرصہ میں اس سے کچھ منفعت نہیں ہوتی
ہے رائے صواب و تدبیر درست اور کامرانی و معاملہ فہمی کا فائدہ
سب چیزوں سے زیادہ ہے جو بے سامان اس کو اختیار کرے جلد
اپنے مطلب کو پہنچے۔ دہقان بچے نے کہا کہ معاملہ فہمی و کامرانی سب
وقت کام نہیں آتی ہے اکثر میں نے دانا حیران اور نادان کو کامیاب
دیکھا ہے بہت سے کسب اور کوششیں ہیں جو آدمی کو کامیاب و
مقصدور بناتی ہیں اور ہنر و حرفہ عقلمند کے سامان دولت کا وسیلہ
ہوتا ہے۔ جب پھر نوبت شاہزادے کی پہنچی۔ یاروں نے التماس کیا
کہ کچھ اور اس باب میں فرمائیے۔ اس نے جواب دیا کہ میں اسی بات
پر ہوں جو میں نے آگے کہی تھی اور تم جو کہتے ہو کہ صورت کے وسیلہ اور
دانش و کسب کے سبب سے دولت ہاتھ لگتی ہے میں اس کا منکر
نہیں۔ پر غرض میری یہ ہے کہ سب کام قضا و قدر کے سلسلے سے
متعلق ہیں۔ حکم الٰہی کے تابع رہا چاہیے اور اپنے کاموں کو تقدیر کے
حوالے کیجیے اور خواہش الٰہی کے منتظر رہئے جس نے ہم کو پیدا کیا ہے
ہماری روزی کے اسباب بھی کر دیے ہیں۔"

(خرد افروز مطبوعہ ۱۸۵۷ء صفحہ ۲۱۱)

خلیل علی خاں اشک

فورٹ ولیم کالج میں خلیل علی خاں ہی ایک ایسے مؤلف ہیں جن کی کتاب تو بیحد مقبول اور رائج ہوئی مگر وہ اس کی بدولت مشہور رہنے کی بجائے بالکل پردۂ گمنامی میں رہے۔ قصۂ امیر حمزہ کے نام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے اس زمانہ میں بھی جبکہ اردو زبان نے ترقی کے کئی مدارج طے کر لیے ہیں اور اس میں ناولوں قصوں اور مختصر افسانوں کا کافی ذخیرہ موجود ہے اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ امیر حمزہ کے شایق اکثر جگہ نظر آتے ہیں اور اب بھی اس کتاب کو تھوڑی بہت مقبولیت حاصل ہے مگر عجیب اتفاق ہے کہ خلیل علی خاں کی محنت شاقہ نے ان کو نام و نمود سے اب تک بالکل محروم رکھا اور شاید یہ پہلی مرتبہ ہے کہ ان کا نام ان کے اپنے کارناموں کے ساتھ اردو داں پبلک سے متعارف کرایا جا رہا ہے انھوں نے جس کاوش اور محنت سے داستان امیر حمزہ سی ضخیم کتاب جو کئی سو صفحات پر مشتمل ہے لکھی ہے اس کی داد دینا تو کجا آج تک کسی نے اس خصوص میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا۔

ہم نے اردو شاعروں کے تقریباً تمام تذکروں کی ورق گردانی کی مگر ان کا حال کسی میں بھی نہیں ملا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کے حالات وغیرہ کے متعلق بہت ہی کم معلومات رکھتے ہیں۔ ان کی مؤلفہ کتابیں بھی ان کے حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈال سکتیں۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے

مولوی عبدالحق صاحب مدیر رسالۂ اُردو نے "اہل یورپ نے اردو زبان کی کیا خدمت کی" کے عنوان سے جو مضمون فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں پر لکھا ہے اس میں خلیل علیخاں کا ذکر کیا ہے مگر صرف اتنا ہی کہ انہوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ٹیلر کے حکم سے اکبر نامہ علامی ابوالفضل کو "واقعات اکبر" کے نام سے اردو میں ترجمہ کیا جو شایع نہیں ہوا۔[1] پھر مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا نے اپنی کتاب میں ان کا ذکر کیا ہے وہ سراسر مولوی عبدالحق صاحب کے بیان کی نقل ہے اور اس میں ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔[2] ان دونو نے خلیل علی خاں کو خلیل اللہ خاں لکھا ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر ان کی جو کتاب ہے اس میں صاف طور پر خلیل علی خاں مندرج ہے اور اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہم آگے کسی موقع پر اشک کا وہ بیان نقل کردینگے جس سے ان کا اصل نام معلوم ہو سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ اشک نے اپنے آباؤاجداد اور مولد ووطن کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا ان کی تاریخ ولادت ووفات تو کہاں مقام پیدائش وتعلیم وتربیت تک کا حال معلوم نہیں۔ بہرحال صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے دورِ اول کے اہل قلم میں سے ہیں ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدائً کالج کے تنخواہ یاب منشی نہیں تھے۔ غالبًا ڈاکٹر گلکرسٹ کے ایما سے اپنے طور پر پہلے یہ کتاب مرتب کی ہوگی اور پھر کالج کے متوسل ہو گئے۔

---

[1] رسالہ اردو نمبر ۱۵، ص ۴۸۵ [2] سیر المصنفین ص ۱۳۶

چار کتابیں ان کی یادگار ہیں - ان میں سے پہلے قصہ امیر حمزہ ہے یہ طولانی اور ضخیم قصہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایماسے سنہ ۱۲۱۵ء میں لکھا گیا ہے اس قصہ کے اصل مصنف کے متعلق مختلف خیالات ہیں اور کوئی قطعی ویقینی رائے قایم کرنا مشکل ہے ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں اشک نے لکھا ہے کہ یہ قصہ سلطان محمود غزنوی (سنہ ۹۹۸ء تا سنہ ۱۰۳۰ء) کے خوش کرنے اور اس فاتح اعظم کو ملک گیری وکشور کشائی کے لیے آمادہ وتیار رکھنے کے لیے کئی ایک راویوں اور داستان گووں نے چودہ جلدوں میں تصنیف کیا۔ ایک اور موقع پر اشک نے ہی اس کو ملا جلال بلخی سے منسوب کیا ہے۔ برٹش میوزیم میں ایک فارسی نسخہ محفوظ ہے، اس میں اس کا مصنف شاہ ناصرالدین احمد کو بتایا گیا ہے اسی میوزیم میں دوسرا نسخہ ابوالعلائی کے نام سے منسوب ہے بعض لوگوں نے اس کو فیضی کے تخلیقی دماغ کی پیداوار بنایا ہے۔ غرض وہ مثل ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہماری دسترس میں اصل فارسی نسخے نہیں ہیں اور شاید ہندوستان میں بہت ہی کم جگہ فارسی نسخے موجود ہونگے - ایسی صورت میں ہم اسکے اصل مصنف کے متعلق کوئی صحیح اور معتبر بات بلا تحقیق کیے نہیں بیان کرسکتے - پھر یہ بھی شبہ ہے کہ یہ قصہ ابتداً عربی میں لکھا گیا یا فارسی ہی میں تصنیف ہوا۔

خلیل علی خاں اشک اور دیگر ہندوستانی مولفین کے جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ

اصل نسخہ فارسی میں اتنا طویل نہ تھا - ان لوگوں نے اس میں ہندوستانی عنصر کو داخل کر کے اپنا لیا ہے آگے اس پر ہم ذرا تفصیل سے بحث کریں گے -

جیسا ابھی ہم نے اوپر لکھا ہے اشک نے اس کو ۱۲۱۵ھ میں مرتب کیا معلوم ہوتا ہے کہ ان سے پہلے اردو میں کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تھی - اور سب سے پہلے اشک نے ہی کو صاف زبان میں نوآموزان اردو کے لیے تالیف کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں :-

"مخفی نہ رہے کہ بنیاد اس قصہ دلچسپ کی سلطان محمود بادشاہ کے وقت سے ہے اور اس زمانہ میں جہاں تک راویان شیریں کلام تھے انہوں نے آپس میں مل کر واسطے سنانے اور یاد دلانے منصوبے لڑائیوں اور قلعہ گیری اور ملک گیری کے خاص بادشاہ کے واسطے امیر حمزہ صاحب کے قصہ کی چودہ جلدیں تصنیف کی تھیں - ہر رات کو ایک داستان حضور میں سناتے تھے انعام اکرام پاتے تھے اب شاہ عالی جاہ عالم بادشاہ کے عہد میں مطابق سنہ بارہ سو پندرہ ہجری اور سنہ اٹھارہ سو ایک عیسوی کے خلیل علی خاں جو متخلص بہ اشک ہے حسب خواہش مسٹر گل کرسٹ صاحب عالیشان والامناقب بنا بر آموزان زبان ہندی اس قصہ کو اردوئے معلی میں لکھا تا کہ صاحبان ہند یان کے پڑھنے کو آسان ہوئے"

اشک کے نسخے پر بحث کرنے سے قبل ایک نظر مروجہ اور جدید نسخوں پر بھی ڈال لینی ضروری ہے - مروجہ نسخوں میں سب سے پہلے منشی نول کشور کا

مرتب کرایا ہوا نسخہ ہے اس کو حافظ سید عبداللہ بلگرامی نے ترتیب دیا تھا اور بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے بڑی محنت سے تعقید عبارت دور کرکے اردوئے معلی کا جامہ پہنایا۔" یہ نسخہ بہت مقبول ہوا۔ چنانچہ چند ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا پھر دو ایڈیشن اور شایع ہوئے چوتھی مرتبہ نول کشور پریس کے مشہور مصحح سید تصدق حسین مرحوم نے جو عربی فارسی کے بڑے عالم تھے اور جن کی یادگار فارسی کی متداولہ و مشہور لغت "لغات کشوری" اب تک مقبول خاص و عام ہے اس کی نظر ثانی کی۔ تصدق حسین لکھنؤ کے باشندے تھے اور ان کی زبان عربی فارسی سے اس قدر متاثر تھی کہ ان کی ہر عبارت سے عربیت اور رنگینی ٹپکتی ہے۔ انہوں نے نظر ثانی میں اس کو تکلفات و آرائشات لفظی سے فسانہ عجائب کا جواب بنا دیا اور جابجا اپنی طرف سے اضافے کیے اور خود بھی افتخار کے ساتھ دعوی کیا ہے کہ "بطور نثر فسانہ عجائب ترتیب دیا"۔ اس سلسلہ میں انہوں نے در پردہ خلیل علی خاں کی عبارت کو تعقید سے معمور کہا ہے اور اس کو صاف زبان میں لکھنے کا سہرا حافظ سید عبداللہ بلگرامی کے سر باندھا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے۔ اشک کی عبارتیں بے حد صاف و سلیس ہیں۔ آگے ہم دونوں کی تھوڑی تھوڑی عبارت جو ایک ہی مضمون سے متعلق ہے نقل کردیں گے جس سے اصل حقیقت ظاہر ہو جائیگی۔

تصدق حسین کا مصحح نسخہ بھی بہت مقبول ہوا۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں ان کا طرز بیان جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بالکل فسانہ عجائب کی تقلید ہے اور ان کو خود بھی نہ صرف اعتراف بلکہ اس پر افتخار ہے اس میں

سادگی و صفائی نام کو نہیں۔ اس نقص کے بعد بھی اس کا مقبول ہونا قوم کی تکلف پسندی اور بگڑے ہوئے مذاق کی دلیل ہے۔ ہر ملک اور قوم کی تاریخ ادبیات میں ایک دور ایسا ضرور ملتا ہے جبکہ ادب سے اصلیت دور ہو جاتی ہے اور بجائے معنوی خوبیوں کے لوگ ظاہری محاسن اور لفظی آرائشات کو پسند کرنے لگتے ہیں صفائی اور سادگی پر تکلفات اور صنائع بدائع کو ترجیح دی جاتی ہے۔ ایسا زمانہ حقیقی ادب کی پیداوار سے محروم رہتا ہے اور اس کا لٹریچر ادب عالیہ نہیں بن سکتا۔ اس کی بہار صرف چند روزہ ہوتی ہے اور کاغذی پھولوں کی طرح وہ بھی ایک محدود عرصہ تک پبلک کے مرغوب طبع رہ کر فنا ہو جاتا ہے۔ انگریزی ادبیات میں پوپ اور اس کے مقلدین کی شاعری کا بھی یہی حال ہے۔ فارسی کے متاخر غزل گویوں کی بھی یہی کیفیت ہے خیالات میں اصلیت، سادگی اور جوش مفقود ہے صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جن میں تاثیر نہیں اسی طرح فارسی کے متاخر نثر نویسوں کے کارنامے بھی اصلیت سے دور ہیں۔ چہار مقالہ نظامی عروضی، سفرنامہ حکیم ناصر خسرو کے مقابلہ میں سہ نثر ظہوری اور رسائل طغرائے مشہدی کو ہمیشہ ہرگز فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک میں بقائے دوام کے آثار ہیں اور دوسرے میں چند روزہ لطف اور موقتی پسندیدگی کے سوا کچھ بھی نہیں اردو میں سرور کے فسانہ عجائب اور تصدق حسین کی مصححہ داستان امیر حمزہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں کا بھی

یہی حال ہے جس طرح اردو شاعری کا مذاق بگڑتے بگڑتے صرف لفاظی اور نقالی رہ گئی نثر نویسی بھی اس قعر میں گر پڑی اور چونکہ ایک زمانہ میں رنگینی سجع اور غفلت سے یہی طرز بیان مقبول تھا ان کتابوں کو بھی مقبولیت مل گئی مگر اب علوم جدیدہ کی ترقی کے ساتھ قوم کے مذاق میں بھی تبدیلی پیدا ہو چلی ہے اور اس قسم کی کتابوں سے عوام کو وہ دلچسپی باقی نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اسی داستان امیر حمزہ کو لیجئے اب سے گیارہ سال پہلے اس کا بارھواں اڈیشن شایع ہوا تھا اب تک دوبارہ چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

اگرچہ اب قدیم قصوں کی طرف سے ان کی فوق العادت اور خلاف فطرت باتوں کی وجہ سے لوگوں کی دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے مگر اشک کے "قصۂ امیر حمزہ" اور اس کے ساتھ کی بعض دیگر کتابوں میں ایسے جوہر ضرور موجود ہیں جو پھر ایک بار ان کو مقبولیت دلا سکتے ہیں جب افسانہ کا احیا ہوگا تو بلحاظ اصلیت و سادگی ان قصوں کو بعد کی مرصع اور پرتکلف کتابوں پر ترجیح حاصل ہو جائیگی اور خود اس وقت بھی اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔ آج کل "فسانۂ عجائب" کو وہ مقبولیت حاصل نہیں جو "باغ و بہار" کو ہے۔

خلیل علیخاں کا طرز بیان نہایت سلیس اور بے تکلف ہے انہوں نے میرامن اور شیر علی افسوس کی طرح دہلی کے ٹھیٹ محاورہ اور روزمرہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا نہیں بنایا بلکہ سنجیدہ عبارت آرائی کی ہے زبان میں گھلاوٹ بھی ہے اور سادگی بھی۔ ہندی اور فارسی کے الفاظ کا استعمال نہایت مناسب

تناسب کے ساتھ کیا گیا ہے اور اکرام علی کی طرح زبان میں روانی اور صفائی بجید ہے۔ کوئی فقرہ ضرورت سے زیادہ طویل نہیں معلوم ہوتا۔ بعض الفاظ جو اب متروک ہو گئے ہیں اس میں بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے دیگر معاصرین کے مقابلہ میں اشک کے ہاں ایسے متروکات کی تعداد بہت تھوڑی ہے بعض جگہ فارسی ترکیبیں اور چھوٹے چھوٹے فارسی ٹکڑے بھی رکھے ہیں مگر ایسی طویل کتاب میں ان کا استعمال بُرا نہیں۔ اس سے بجائے مصنوعیت پیدا ہونے کے اصلیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔

امیر حمزہ کی داستان اردو ادبیات میں عجیب اہمیت رکھتی ہے پہلے ہی یہ قصہ چار جلدوں میں لکھا گیا تھا۔ منشی محمد حسین جاہ اور منشی احمد حسین قمر نے اس کے مضمون کو طوالت دیکر اور حاشیے چڑھا کر کئی جلدیں طلسم ہوش ربا کی تیار کیں پھر دوسروں نے اس سلسلہ کو اور آگے بڑھایا اور شبدیز قلم کی جولانیوں سے طلسم ہفت پیکر، طلسم جمشید نوروزی، ایرج نامہ، اختر نامہ وغیرہ خدا جانے کتنے ناموں سے اس سلسلہ کی جلدوں پر جلدیں تیار کیں۔ غرض انسائیکلوپیڈیا برٹیانیکا (قاموس العلوم برطانیہ) کی طرح اس سلسلہ کا ایک اچھا خاصہ کتاب خانہ بن گیا اور داستان پسند پبلک کی ضیافت طبع کے لیے اتنا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا کہ عمر کا بہت بڑا حصہ اس کے مطالعہ کی نذر ہو جائے۔

قصۂ امیر حمزہ کے رجال داستان میں عرب و عجم کی مشاہیر ہستیوں کی عجیب آمیزش ہے، ایک طرف امیر حمزہ، عمرو عیار اور مقبل کی سی ہستیں

عربی ہیں تو دوسری طرف بزرجمہر، بختک، قباد، اور نوشیروان وغیرہ خالص ایرانی ہیں پھر تاریخی اور افسانوی شخصیتوں کو عجیب انداز سے مدغم کیا گیا ہے بعض رسمیں اور طریقے خالص ایرانی ہیں جن سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ ابتداً فارسی ہی میں تصنیف ہوا تھا جیسے اڑتے ہوئے پرندوں میں سے کسی خاص پرندے کو تاک کر تیر مارنا اور اگر تیر اسی کے لگے تو اس سے اپنے مقصد میں کامیابی و موافق مرام نتیجہ کی فال لینا جس کو فال گوش کہتے ہیں یہ خالص ایرانی دستور ہے اگرچہ اس کے علاوہ ساری داستان میں بہت سی باتیں خالص ہندستانی بھی ہیں جن سے صاف پتا چلتا ہے کہ اردو میں منتقل کرتے وقت مترجم کے دماغ رسا نے یہ اضافے کیے ہیں اور اصل قصے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے مثلاً مدرسہ میں عمرو عیار کی شرارتوں کی جو تفصیل دی ہے وہ سب ایسی شرارتیں ہیں جو نہ صرف ہندوستانی طلبہ میں پائی جاتی ہیں بلکہ خاص اسی ملک کی چیزیں ہیں۔ یا عمرو عیار ایک دفعہ زر نذرانہ وصول کرنے کے لیے مدائن جاتا ہے اور وہاں اپنے آپ کو گاؤں کا باشندہ بتاتا اور نوشیروان سے دیہاتی زبان میں گفتگو کرتا ہے اس موقع پر قصہ نویس نے جو زبان استعمال کی ہے وہ صوبۂ اودھ کے ایک گاؤں کی ہے۔ عمرو عیار کا ایک دفعہ سمندر میں کشتی سے ٹاپو پر کود پڑنا اور پھر ایک موقع پر ساحل پر اترتے ہی نسمہ پا اشخاص کا نظر آنا یہ ٹکڑے الف لیلہ سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح سراندیپ کے بادشاہ لندھور سے لڑنے جانے سے قبل امیر حمزہ کا محل نوشیروان میں بلایا جانا

اور ان کی اس شرط پر کہ فتح و کامیابی کے بعد مہر نگار دختر نوشیرواں سے ان کا عقد کر دیا جائے، ان کو شربت پلانا اور پان کی گلوریاں دینا خالص ہندوستانی رسمیں ہیں جن کو ایران سے کچھ علاقہ نہیں۔ قصہ نویس نے القش وزیر کے اس تخت کی ساخت کا تخیل جو اس نے بادشاہ قباد کے لیے بنایا تھا شاہجہاں کے تخت طاؤس سے لیا ہے۔ غرض پوری داستان میں ایسی بیسیوں باتیں ہیں جن سے بخوبی واضح ہے کہ یہ مترجم کے حاشیے ہیں اور اس نے اس قصہ کو اپنا لیا ہے۔

یوں تو اس قصہ کے اکثر و بیشتر رجال داستان میں فوق العادت اور بعض مرتبہ خلاف عقل باتیں بھی دکھائی گئی ہیں مگر ساری داستان میں سب سے زیادہ اہم کردار عمرو عیار کا ہے۔ عمرو عیار اس قصہ کی جان اور مرکز ہے اس کے کردار میں عجیب عجیب گلکاریاں کی گئی ہیں اور اس کو ایسا چالباز، مبارز طلب اور مہم باز بتایا گیا ہے کہ اس کے آگے یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کے جنگجو نائٹ اور اڈونچرر کوئی حقیقت نہیں رکھتے مگر اس کے کردار میں شروع ہی سے بری خصلتیں اور طمع و چالبازی کے عناصر شامل کر کے اس کو نیکی سے دور بتایا ہے۔ غرض اس "سردار عیاران" سے ایسے ایسے کارنامے منسوب کیے گئے ہیں کہ عقل انسانی سے باہر ہیں۔

ذیل میں ہم ایک ہی مضمون کے متعلق اشک اور تصدق حسین دونوں کے نسخوں سے ایک ایک بیان نقل کرتے ہیں ان دونوں میں

وہی فرق ہے جو اصل اور نقل میں ہوتا ہے۔ ایک سرتا پا صفائی، سادگی اور اصلیت کا نمونہ ہے تو دوسرا بالکلیہ مرصع و مسجع، تکلف اور مصنوعیت کا مظہر ہے۔

حکایت" یہاں سے دو کلمہ داستان ملک النقش کے ملاحظہ فرمایئے جبکہ وہ باغ تیار ہوا ایک دن بادشاہ کے حضور میں عرض کی غلام نے ایک باغ حضور کی بدولت بنایا ہے اور بندہ امیدوار ہے کہ ظل سبحانی وہاں رونق افروز ہو کر ایک چمچہ آتش نوش جان فرمائیں کہ باعث عزت از دیاد خانہ زاد ہے۔ مصرع

شاہاں چہ عجب گر بہ نوازند گدارا۔ فرمایا کیا مضائقہ تم جا کر تیاری کرو ہم بھی آتے ہیں۔ النقش حضور سے رخصت ہو کر واسطے تیاری کے آگے گیا۔ بعد اس کے جانے کے بادشاہ بھی زمرد کے تخت پر سوار ہو کر اور تمام وزراء و امراء ہمراہ لے کر طرف باغ بیداد کے رونق افزا ہوئے جبکہ سواری قریب باغ کے آئی۔ ملک النقش نے ایک تخت ہوادار واسطے بادشاہ کے ایسا تیار کیا تھا کہ اس میں گل اور بوٹے لعل اور الماس کے تھے اور چاروں کونوں پر اس کے چار طاؤس زمرد کے بنائے تھے۔ کہ جنھوں کے پیٹ میں لخلخے خوشبو کے رہتے تھے اور واسطے تخت کی شان کے طاؤس کے پہلو میں دونوں طرف ایک ایک نرگس دان رکھا تھا کہ جن کے کونے مرصع کے مثل زمرد سر بسر تھے اور الماس کے پھول جنھوں کی

زردی پکھراج کی سی تھی اس کو معہ ہودجوں اور چالیس ہاتھیوں
جن پر جھولیں زربفت کی پڑی ہوئیں اور عماریاں کارزری وجواہر
نگار انہوں کی پیٹھ پر کسی ہوئیں اور دوسو گھوڑے عربی، عراقی، ترکی،
تازی معہ جواہر مرصع اور کئی اونٹ بغداد کے دو کوہانی کہ جن کے
کجاؤں پر کارچوبی زربفت کی چادریں کسی ہوئیں اور کتنے خیمے اور
کتنی کشتیاں سلاح اور جواہرات کی اور پارچہ جات سوتی اور
ریشمی اور پشمینے اپنے ساتھ لیے اور باہر کے جلوخانہ تک استقبال
کرکے بادشاہ کو یہ سب نذر گزرانا۔ اور تخت کا پایہ پکڑ کر بوسہ دیا۔
اور ہمراہ ہوا۔ جبکہ بادشاہ اندر باغ کے گئے دیکھا تو واقعی عجب
گلزار ہے کہ شاید اور کہیں ایسا نہ ہوگا اس کی وہ چاردیواری
سنگ مرمر کی جس میں تمام فیروزے کی تحریر اور طرح بہ طرح کی
بیل ہے اور نیچے ان دیواروں کے ہر طرف سنہری چوبوں کی پشت دار
بنی ہوئی کہ اس میں پتے زمرّد کے اور خوشے موتیوں کے لگے ہوئے
ہیں اور وہ صاف روشنی سبزے کا عالم، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا پھولوں
کی خوشبو ہر دم جس سے دماغ کو قوت ہوتی تھی۔ کیاریاں اقسام
اقسام کی۔ گلزار ہر قسم کے پھول جس میں پھولے ہوئے مثل گل لالہ،
نافرمان، بابونہ، گیندا، جوہی، سوسن، چنبیلی، موتیا، موگرا،
رائے بیل، گلاب، سیوتی، کلغا، گل مہدی۔ گل شبو، نرگس،
داؤدی، ہر ایک طرح کی بہار تھی۔ اور دونوں طرف روش کے

دو بڑے پیڑ چمپا۔ اور مولسری کے بہت خوبصورت پھولے جنکی
تمام ٹہنیوں پر اور شاخوں پر غارے اور بادلے چڑھے ہوئے
وہ مہندی اور رائے بیل کی ٹہنیوں تک شان وہ چبوترے کی نہر
مثل لوح الماس لبالب پانی کے ہر چہار طرف گئی کہ جس کے
فواروں پر ہزارہ کی جا طوطے بلبل فاختہ اور عندلیب جواہرات
کے بنے ہوئے کہ جن کے پر و بال سے ہزارہ چھٹتا ہوا ایک لطف
دیتا تھا۔ اور سفید عالم عمارت کا کہ جس میں سنہری روپہلی
الماس تراش استادوں پر تمام تمامی کے سائبان کھنچے ہوئے
کہ جن میں سراسر موتیوں کی جھالر تھی اور سونے کی تیلیوں کی
چلمنیں ریشے سے رنگی ہوئیں۔ پوٹی داروں پر کلابتون کی ڈوریوں
کی زربفت کے پردوں کے ساتھ بندھی ہوئی۔ غرض بادشاہ
اس باغ کو دیکھ کر اپنے باغ کو بھول گیا۔

(قصۂ امیر حمزہ از اشک صفہ)

نخلبندان بوستان اخبار و چمن پیرایان گلستان اظہار
تختہ کاغذ صاف میں اس طرح اشجار الفاظ موقع موقع پر
نصب فرماتے ہیں صحن شفاف قرطاس کو گل ہائے مضامین
رنگا رنگ سے یوں رشک ریختہ ارژنگ بناتے ہیں کہ جب
باغ بیدار تیار ہوا نمونہ بہشت شداد نمودار ہوا۔ القصہ خوشی سے
پھول گیا۔ فکر دارین بھول گیا۔ فرط مسرت سے پھولا نہ سماتا تھا۔

جامہ تن باہر ہوا جاتا تھا۔ بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ غلام نے حضور کی بدولت و اقبال ایک باغ تیار کیا ہے۔ انواع انواع کے درخت ثمردار اور گل بوٹے کے لگائے ہیں۔ دور دُور سے بہ صرف زرِ کثیر نادر نادر درخت منگوائے ہیں، باغبان نادر کار نخلبندی میں ہوشیار بہم پہنچائے ہیں۔ ہزار ہا روپے صرف کر کے سیکڑوں استاد اس فن کے بلوائے ہیں۔ ہر ہر شخص یکتائے زمانہ ہے اپنے اپنے ہنر میں یگانہ ہے بیل بوٹے ایسے لگائے ہیں کہ مانی و بہزاد اپنی صنعت سے شرمائے ہیں مگر جان نثار کی نظروں میں سماتا نہیں۔ خزاں کا رنگ باغ میں معلوم ہوتا ہے جب تک ظلِ سبحانی خلیفۃ الرحمانی کا قدم مبارک اس میں جاتا نہیں۔ ناسخ ؎

سرسبزہ ہو جو سبزہ ترا پائمال ہو ٹھیرے تو جس شجر کے تلے وہ نہال ہو

امیدوار ہوں کہ حضرت خاقانِ جہاں نوشیروان زماں بطریق گل گشت کبھی اس طرف توجہ فرمائیں۔ خانہ زاد موروثی کا رتبہ فلک اعظم تک پہنچائیں۔ حضرت کے قدموں کی برکت سے باغ میں بہار آجائے ہر گل و غنچہ اپنا اپنا رنگ دکھائے۔ از راہِ غلام نوازی اگر دو ایک میوے نوش جان فرمائیں۔ غلام کو ثمرہ مراد حاصل ہو، اشجار امید بار لائیں۔ بادشاہ نے اس کے التماس کو قبول فرمایا۔ معروضہ اس کا درجۂ اجابت میں لایا۔

النقش نے تسلیم بجالا کر نذر گزرانی ۔ رخصت ہوا باغ میں آکر
سامان دعوت کرنے لگا۔ آناً فاناً سب اسباب ضیافت کا
مہیا ہو گیا ۔ اقسام اقسام کے کھانے تیار ہونے لگے ۔ طرح طرح کے
میوے کشتیوں میں چنے گئے ۔ ارباب نشاط کو حاضری کا حکم ہوا۔
آتش بازوں نے آتش بازی چھوڑنے کا موقع ڈھونڈ رکھا، روشنی
کا سامان ہونے لگا ۔ ہزارہا گلاس چڑھ گیا۔ جھاڑ فانوس
دیوار گیریاں صاف ہونے لگیں ۔ موی کافوری شمعیں چڑھائی
گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ جم جاہ فلک رفعت خورشید
طلعت داد گر انصاف پرور مع ارکان دولت و اعیان سلطنت
بہار افزائے باغ بیداد ہوا۔ النقش کا شجر مقصود بار لایا۔"
(داستان امیر حمزہ از تصدق حسین ص۱۵)

اشک کے نسخہ سے اوپر ہم نے جو حکایت نقل کی ہے وہ ان کی
رنگین بیانی کا بہترین نمونہ ہے اور ساری کتاب میں سے اس سے زیادہ
مرصع اور رنگین بیان کوئی نہ ملے گا ۔ مگر تصدق حسین کے نسخہ سے جو عبارت
نقل کی گئی ہم نے قصداً اسی پر اکتفا کیا اور یہ بھی طویل ہے اس کے
بعد تخت اور باغ کا جو نقشہ انھوں نے کھینچا ہے وہ اتنا طویل ہے کہ ہم
کو بخوف طوالت مجبوراً چھوڑ دینا پڑا ۔ اس کی رنگینی و آرائش کے لیے
یہ کہنا کافی ہے ۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

اشک کا دوسرا اور قابل قدر کارنامہ "واقعات اکبر" ہے انہوں نے ۱۸۰۹ء میں کپتان ولیم سٹلر کے ایما سے علامی ابوالفضل کی مشہور کتاب اکبر نامہ کا اردو میں اس نام سے ترجمہ کیا تھا۔ یہ بدقسمتی سے شایع نہیں ہوا۔ یورپ کے بڑے بڑے کتب خانوں میں بھی اس کا قلمی نسخہ یا مسودہ موجود نہیں ہے۔ اکبر نامہ جیسی اہم اور مفید کتاب ہے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ اشک کا یہ ترجمہ دست برد زمانہ سے محفوظ ہے یا نہیں۔ اگر یہ کتاب دریافت و شایع ہو جائے تو ہماری تاریخ کے سرمایہ میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوگا۔

مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اپنے مضمون[1] میں لکھا ہے کہ انہیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے کتب خانہ میں اشک کی دو اور کتابیں ملیں (۱) قصۂ گلزار چین (۲) رسالہ کائنات۔ ان میں سے پہلی کتاب چین کے شہزادہ رضوان شاہ اور روح افزا پری زاد بادشاہ اجنہ کی لڑکی کے معاشقے کی داستان ہے۔ یہ فارسی کے ایک مشہور قصہ کا ترجمہ ہے۔ اشک نے اس کو ہنری بوٹ کے سے ۱۸۰۴ء م ۱۲۱۹ھ میں مرتب کیا ہے۔ اس قصے کو قطب شاہی شاعر فایز نے ۱۰۹۴ھ میں اور پھر مولانا باقر آگاہ نے ۱۲۱۱ھ میں نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ اشک کے ترجمے کا نمونۂ عبارت

---

[1] مجلہ مکتبہ جلد ۹ شمارہ ۴۔

یہ ہے۔

"بلادِ چین میں ایک بادشاہ عادل و باذل رعیت پرور غریب نواز داد گستر ایسا تھا کہ اقلیم سبع آفتاب مہتاب کی شکل اس کے فیض سخاوت و عدالت سے روشن تھی۔ جناب باری نے اُسے ہر ملک کی شہریاری دی تھی۔ روز و شب عیش و عشرت میں رہتا تھا۔ اس کے شہر میں دن عید اور شب شب برات تھی۔ کسی کو کسی بات کا غم نہ تھا۔ بادشاہ کو سدا ایک غم فرزند رہتا تھا۔ اس کے گھر میں اولاد نہ تھی۔

رسالۂ کائنات جو ایک مختصر سا رسالہ ہے سنہ ۱۸۰۳ء م سنہ ۱۲۱۷ھ میں ڈاکٹر جان گل کرسٹ کی فرمایش سے مرتب کیا گیا جس کی مصنف نے دیباچہ کتاب میں صراحت کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس کا کوئی نمونہ نقل نہیں کیا

خلیل علیخاں کے تخلص اشک سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور شاعر ہونگے۔ اور اس زمانہ میں شاعری کا گھر گھر چرچا بھی ان کے شاعر یا ناظم ہونیکا خیال پیدا کرتا ہے اول تو ان کا ذکر ہی کسی تذکرہ میں نہیں پھر انتخابی اشعار ملیں تو کہاں سے ان کا کوئی دیوان ہی نہیں جس سے دو چار شعر مل سکیں قصۂ امیر حمزہ میں کہیں کہیں ایک آدھ ان کا طبع زاد شعر مل جاتا ہے مگر وہ ان کی شاعری کا کوئی اچھا نمونہ نہیں ہو سکتا۔

مولوی اکرام علی

مولوی اکرام علی ڈاکٹر گل کرسٹ کے وطن واپس ہوجانے کے بعد فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے یہ فورٹ ولیم کے دوسرے دور کے اہل قلم میں ہیں انہوں نے کپتان جان ولیم ٹیلر کے ایما سے رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا عربی سے اردو میں ترجمہ کیا۔ یہ رسائل بصرہ کی ایک علمی انجمن موسوم بہ اخوان الصفا کی یادگار اور دس مختلف علم دوست آدمیوں کی تحقیقات اور موشگافیوں کا ماحصل ہیں ان رسائل کی جملہ تعداد اکاون بتائی جاتی ہے اور ان میں مختلف دلچسپ اور عجیب و غریب موضوعات پر عقلی اور نقلی بحثیں کی گئی ہیں یہ رسالہ اس سلسلہ کا پہلا نمبر ہے جس میں مخلوق میں افضلیت پر انسان اور حیوانوں میں شاہ اجنہ کے سامنے بڑے زور و شور کی بحث ہوتی ہے۔ ہر ایک فریق اپنی عقلی و نقلی دلائل سے اپنی فضیلت ثابت کرتا اور حریف سے بازی لیجانا چاہتا ہے بالآخر انسان کی افضلیت تسلیم کرلی جاتی ہے اور وجہ ترجیح یہ قرار دی جاتی ہے کہ انسان علوم و معارف الٰہی سے آگاہ اور امانت الٰہی کا جس کو اٹھانے کی کسی مخلوق نے حامی نہیں بھری حامل پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کے رسالوں میں ان تمام علوم و معارف الٰہی کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل ہوا تاکہ فضیلت انسانی کی حقیقت سے واقف ہو کر لوگ اس درجہ کمال کو حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اپنے میں وہ تمام اوصاف

پیدا کریں جو حقیقی معنے میں انسان بننے کے لیے ضروری ہیں اور جن کے حصول کی
مشکلات پیشِ نظر رکھ کر غالب نے فرمایا ہے ع

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

مولوی اکرام علی بہت ہی گمنام شخص ہیں ان کے حالات معاصرین
نے بھی بیان نہیں کیے ہیں۔ مولف طبقات الشعرائے ہند نے ان کا ذکر
تو کیا ہے مگر حالات پر کچھ روشنی نہیں ڈالی۔ خود انہوں نے بھی
اپنے متعلق بہت ہی کم لکھا ہے۔ جو کچھ معلوم ہوسکا وہ یہ ہے کہ
ان کے بھائی تراب علی جو عربی اور فارسی کے اچھے عالم تھے غالباً
کلکتہ میں کمپنی کے ملازم اور کسی علم دوست انگریز کے میر منشی تھے
انہوں نے ان کو کلکتہ بلایا اور ایک انگریز مسٹر ابراہم لاکٹ کے توسط
سے ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازم رکھوایا۔ اس انگریز نے ان کو
اپنے ہاں متعین کر لیا تھا کئی دن کے بعد فورٹ ولیم کالج کے
اردو پروفیسر کپتان جان ولیم ٹیلر نے انہیں کالج میں منتقل کیا اور
ان سے "اخوان الصفا ہندی" مرتب کرائی۔ چنانچہ انہوں نے
اس کے دیباچہ میں اپنا حال اور اپنی کتاب کی کیفیت اس طرح
بیان کی ہے۔

جب میں بموجب حسن ایماء جناب صاحب نامدار ......
خداوند نعمت ابراہم لاکٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کے اور موافق
طلب اخی و استادی جناب بھائی صاحب قبلہ مولوی تراب علی صاحب دام ظلہم کے

شہر کلکتہ میں آیا اور رہنمونی طالع سے بعد حصول شرف ملازمت مورد
عنایت و مرحمت ہوا۔ از بسکہ صاحب موصوف کو کمال پرورش منظور تھی،
سرکار کمپنی بہادر میں نوکر رکھوا کر اپنے پاس متعین کر لیا بعد چند روز کے
باستصواب جناب عالی شان .... مدرس ہندی
کپتان جان ولیم ٹیلر صاحب بہادر دام دولتہ نے فرمایا کہ رسالہ اخوان الصفا
کہ انسان و بہائم کے مناظرے میں ہے تو اس کا زبان اردو میں ترجمہ
کر، لیکن نہایت سلیس کہ الفاظ مغلق اس میں نہ ہو ویں جیسے
اصطلاحات علمی اور خطبے بھی اس کے کہ تکلف سے خالی نہیں ہیں
قلم انداز کر صرف خلاصہ مضمون مناظرہ کا چاہیے۔ راقم نے بموجب فرمانے
کے فقط حاصل مطلب کو محاورہ اردو میں لکھا خطبوں کو نکال ڈالا اور
اکثر اصطلاحات علمی کہ مناظرہ سے ان کو علاقہ نہ تھا کہ ترک کیں مگر جتنے
خطبے اور اصطلاحات ہندسی وغیرہ کہ اصل مطلب سے متعلق تھے
باقی رکھے۔"

یہ رسالہ ۱۲۲۵ھ مطابق ۱۸۱۰ء میں مرتب ہوا جیسا کہ مؤلف کے
بیان سے ظاہر ہے "ترجمہ اس رسالہ کا خلاصہ ایوان ذوالاقتدار
.... نواب گورنر جنرل لارڈ منٹو بہادر دام اقبالہ
کے عہد حکومت میں کہ سنہ ہجری بارہ سے پچیس اور عیسوی اٹھارہ سے دس
میں مرتب ہوا۔"

سر جارج ابراہم گیرسن نے لنگوسٹک سروے آف انڈیا میں ...

مختلف اڈیشنوں کی جو تفصیل دی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب ایک عرصہ دراز تک مقبول خاص و عام رہی چنانچہ اس کا پہلا اڈیشن کلکتہ سنہ ۱۸۱۱ء یعنے تالیف کے ایک سال بعد ہی شایع ہوا اس کے بعد سے ہندوستان کے تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں سے اس کے متعدد اڈیشن نکلے۔ منشی سید حسین اور ٹی ایچ میاڈول نے اس کو انگریزی میں بھی ترجمہ کیا ہے مگر آج کل اس کے نسخے بہت کم یاب ہیں اردو کی دوسری قدیم کتابوں کی طرح ان دنوں یہ بھی خاص و عام کی نظروں سے پوشیدہ ہے اور کوئی شخص اس کو مطالعہ کرتا نظر نہیں آتا کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں اس کے دو نہایت قدیم مگر مطبوعہ نسخے محفوظ ہیں ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے وہ بھی بہت قدیم اور بمبئی کے مطبع حیدری کا مطبوعہ سنہ ۱۲۸۷ھ ہے۔

مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے کہ مولوی اکرم علی شاعر بھی تھے۔ اور اکرام تخلص کرتے تھے مگر ان کا کوئی شعر نقل نہیں کیا۔ اسی تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اخوان الصفا کا ترجمہ کرنے کے بعد بھی وہ کالج کے متوسل رہے اور سنہ ۱۸۳۱ء میں کالج کے محافظ کتب خانہ تھے۔ مولوی اکرام علی نے اس رسالہ کے علاوہ اور کوئی کتاب تالیف یا ترجمہ نہیں کی۔ اور اخوان الصفا ہی ان کا واحد یادگار کارنامہ ہے۔

اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا طرز بیان بالکل آسان اور عام فہم تھا انہوں نے اپنے افسر اعلی کے حکم سے ..... مناظرہ جیسے دقیق مضمون کی کتاب کو بالکل سہل اور سلیس کردیا ہے اگرچہ اس میں سوا سو برس پہلے کے بعض مروجہ الفاظ جو اب متروک ہوگئے ہیں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں لیکن عبارت تعقید سے بالکل پاک ہے جیسا کہ مولف نے دیباچہ میں بیان کردیا ہے وہ تمام دقیق علمی اصطلاحات و خطبات کو خارج کرکے نفس مضمون کو سلیس اور صاف زبان میں بیان کرتے ہیں اور مناظرہ میں قصہ کہانی کا لطف پیدا کردیتے ہیں اور یہ ان کی خاص خوبی ہے۔ اگر وہ اس کو اس قدر سلیس اور عام فہم نہ کرتے تو مولوی امانت اللہ کے ترجمہ اخلاق جلالی کی طرح یہ کتاب بھی طاق نسیان کی نذر ہوجاتی اور اس کو ہرگز وہ مقبولیت حاصل نہ ہوتی جو اس نے اپنی پہلی اشاعت کے ساتھ ہی پیدا کرلی تھی۔ میر بہادر علی حسینی کی طرح ان کی زبان میں بھی محاورہ کی چاشنی نہیں مگر علمی مباحث اور عقلی دلائل میں جو سنجیدگی ہونی چاہیے اس کا لحاظ کرتے ان کا طرز بیان کافی دلچسپ ہے ہندی اور عربی کے دقیق اور غیر مانوس الفاظ سے بھی احتراز کیا گیا ہے اور باوجود عربی کے اچھے عالم ہونے کے ثقیل الفاظ سے اجتناب کرکے اردو کے مروجہ الفاظ و تراکیب کو ترجیح دی ہے اور جہاں تک ہوسکا ہے سیدھی سادی زبان میں خیالات ظاہر کردیے ہیں۔ اصل کتاب میں

جہاں جہاں قرآنی آیات اور احادیث نبوی صلعم آئی ہیں ان کو
اردو اور عربی دونوں میں لکھدیا ہے ۔ ذیل میں تیسری فصل کا
ایک اقتباس بطور نمونہ درج کیا جاتا ہے ۔ اس فصل میں
صورتوں اور قدوں کے اختلاف پر معقول اور مدلل بحث کی ہے
اور فریقین مباحث میں سے ہر ایک کی طرف سے ممکنہ دلیلیں
وضاحت کے ساتھ پیش کی گئی ہیں تا کہ نفس مضمون معقولیت
کے ساتھ ذہن نشین ہو جائے ۔

"اللہ تعالٰے نے جس گھڑی انسانوں کو پیدا کیا عریان
محض تھے بدن پر کچھ نہ تھا کہ سردی اور گرمی سے محافظت ہیں
پھل پھلاری جنگل کے کھانے اور درختوں کے پتوں سے تن کو
ڈھانپتے اس واسطے ان کے قدوں کو سیدھا اور لنبا بنایا
کہ درختوں کے پھل توڑ کر بہ آسانی کھائیں اور اپنے تصرف
میں لاویں اور غذا ہماری گھاس ہے اس لیے ہمارے قدوں
کو ٹیڑھا بنایا ہے کہ بخوبی چھوئیں اور کسی نوع کا دکھ نہ اٹھائیں
بادشاہ نے کہا یہ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان
فی احسن تقویم یعنے انسان کو ہم نے نہایت سڈول
بنایا ہے اس کا کیا جواب دیتے ہو ۔ اس نے عرض کیا ۔
جہاں پناہ ! کلام ربانی میں ظاہر معنوں کے سوا بہت سی
تاویلیں ہیں کہ بغیر اہل علوم کے کوئی نہیں جانتا

تفسیر اس کی عالموں سے پوچھا چاہیے۔ چنانچہ ایک حکیم دانشمند نے بموجب حکم بادشاہ کے مطلب اس آیت کا یوں ظاہر کیا۔ جس دن اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا سبھ گھڑی، نیک ساعت تھی۔ ستارے اپنے اپنے برج شرف میں جلوہ گر اور ہیولے عناصر کے واسطے قبول کرنے صورتوں کے آمادہ و مستعد تھے۔ اس لیے صورتیں اچھی، قد سیدھے ہاتھ پاؤں درست بنے اور احسنِ تقویم کے ایک معنی اور بھی اس آیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ فعدلک فی ای صورۃ ما شاء رکبک یعنی اللہ تعالے نے انسان کو حدِ اعتدال پر پیدا کیا ہے۔ نہ بہت لمبا بنایا نہ چھوٹا بادشاہ نے کہا اس قدر اعتدال اور مناسبت اعضاء کی واسطے فضیلت کے کفایت کرتی ہے حیوانوں نے عرض کی کہ ہمارا بھی یہی حال ہے اللہ تعالیٰ نے ہم کو بھی ساتھ اعتدال کے جو مناسب تھا ہر ایک عضو بخشا۔ اس فضیلت میں ہم اور وے برابر ہیں۔ انسان نے جواب دیا کہ تمہارے لیے مناسبت اعضاء کی کہاں ہے۔ صورتیں نیٹ مکروہ، قد بے موقع، ہاتھ پاؤں بھدے کیونکہ تم میں سے ایک اونٹ ہے۔ ڈیل بڑا۔ گردن لمبی دُم چھوٹی۔ اور ہاتھی ہے جس کا ڈیل ڈول بہت بڑا اور

بھاری دو دانت لمبے منہ سے باہر نکلے ہوئے کان چوڑے
آنکھیں چھوٹی چھوٹی ۔ بیل اور بھینسے کی دم بڑی ۔ سینگ
موٹے، اوپر کے دانت نہیں ۔ خرگوش کا قد چھوٹا ۔ کان بڑے
اس طرح بہت سے درند وچرند وپرند ہیں کہ قد وقامت
اُن کا بے موقع، ایک عضو سے دوسرے کو کچھ مناسبت
نہیں "

نہال چند لاہوری

فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں سے نہال چند لاہوری بھی بہت مشہور ہیں مگر بعض اور منشیوں کی طرح اُن کے حالات پر بھی گہرا پردہ پڑا ہوا ہے۔ منشی کریم الدین مؤلف طبقات الشعرائے ہند نے بھی ان کا ذکر نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعر نہیں تھے اور انہوں نے ایک آدھ شعر بھی نہیں کہا ان کے نام کے ساتھ لاہور کی نسبت ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے مگر ان کا مولد اور ان کے آبا و اجداد کا وطن شاہجہاں آباد دہلی تھا اور وہ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کے دیگر شرفا کی طرح ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے اور لاہور میں توطن اختیار کیا اور آگے چل کر لاہوری کہلائے۔

ایک انگریز کپتان ولورٹ نامی سے نہال چند لاہوری کے قدیم مراسم تھے اس کی سفارش اور وساطت سے وہ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ہاں باریاب ہوئے اور فورٹ ولیم کالج کے شعبۂ تالیف و تراجم میں ملازم رکھ لیے گئے۔ نہال چند لاہوری کا صرف ایک ہی کارنامہ "مذہب عشق" ہے اور انکی تمامتر شہرت بھی اسی ایک کتاب کی بدولت ہوئی ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے ترجمہ کی تھی۔ چنانچہ اس کے دیباچہ میں اس کے ترجمہ اور کچھ اپنے احوال کے متعلق لکھتے ہیں۔

"اس کتاب کے ترجمہ کا یہ سبب ہے کہ مستمند نہال چند لاہوری کو

کہ اس نحیف کا مولد شاہجہاں آباد ہے۔ اشرف البلاد کلکتہ میں کہ بالفعل ہندوستان کا دارالعمارت ہے آب خورش کھینچ کر لائی اور یہ خاکسار کپتان ولورٹ صاحب بہادر کی خدمت میں سابق سے بندگی رکھتا تھا۔ ان کی دستگیری سے صاحب خداوند نعمت صاحب گل کرسٹ صاحب بہادر مدظلہٗ کے دامن دولت تک دسترس پایا۔ غرض کہ صاحب بہادر کے تفضلات سے بخوبی اس ضعیف کی اوقات بسر ہونے لگی اور امید زیادہ تر ہونے لگی۔ کہ اگر بخت مددگار ہے اور یہ دامن دولت اپنے ہاتھ ہے تو حشمت قدم کے ساتھ ہے۔ پھر ایک روز خداوند نعمت نے ارشاد کیا کہ تاج الملوک اور بکاؤلی کا قصہ فارسی میں ہے۔ ہندی ریختہ کے محاورہ میں ترجمہ کر کہ تیری سرخروئی اور یادگاری کا موجب اور ہماری خوشنودی کا باعث ہو۔ چنانچہ اس نحیف نے حسب الارشاد فیض بنیاد اپنے حوصلے کے موافق افلاطون فطنت مارکوئیس ولزلی نواب گورنر جنرل دام اقبالہ کے عہد میں ہندی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام "مذہب عشق" رکھا۔"

یہ قصہ ابتداءً شیخ عزت اللہ بنگالی نے جو ۱۲۲۴ھ میں فوت ہوا ہے فارسی میں اپنے ایک عزیز دوست نذر محمد کے ایما سے تصنیف کیا تھا۔ اور اس دوست کے قضا کر جانے پر بطور اس کی یادگار کے اس کو جو مسودہ کی صورت میں پڑا ہوا تھا صاف کیا اور اشاعت دی۔ یہ قصہ بظاہر کوئی قدیم قصہ نہیں ہے مگر قبول خاطر و لطف سخن خداداد است۔ کچھ اس قدر

جلد مشہور ہو گیا کہ شاید ہی ایسی کتابوں میں سے کسی اور کو اتنی شہرت نصیب ہوئی ہو۔ عام خاص لوگ اس کو قدیم مشہور کتابوں کی طرح دلچسپی سے پڑھنے لگے۔ اس کی مقبولیت دیکھ کر دیکھکر ڈاکٹر گل کرسٹ نے اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت محسوس کی اور نہال چند سے ترجمہ کرایا۔

"مذہب عشق" تاریخی نام ہے اور اس کے ترجمہ کا سنہ ۱۲۱۷ نکلتا ہے۔ اختتام کتاب پر مترجم نے ہجری اور عیسوی تاریخ کے حساب سے دو قطعات بھی دیے ہیں :—

یہ قصہ ہوا جب بخوبی تمام
تو پھر فکر تاریخ تھی صبح و شام

یکایک سنی میں نے آواز غیب
کہ ہے مذہب عشق تاریخ و نام

ہوئی پھر یہ خواہش کہ کلک زباں
کریں عیسویں سال کو بھی بیاں

تو پھر ہاتف غیب نے دی ندا
کہ اس مذہب عشق میں کوئی آ

کرے مشرب جام گر جستیا
تو راز نہاں اس پہ ہو آشکار

مذہب عشق بہت مقبول ہوئی اور اب بھی قدیم قصہ کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اس کا مطالعہ کرتے نظر آتے ہیں چنانچہ ہمارے پاس جو نسخہ ہے وہ اب سے کوئی سات سال بیشتر کا چھپا ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب بھی اس کے قدر دان تھوڑے بہت موجود ہیں اس کی پہلی اشاعت ۱۸۰۴ء میں کلکتہ سے ہوئی تھی۔ دوسرے ایڈیشن کے وقت میر شیر علی افسوس مولف "باغ اردو" نے اس کی نظر ثانی بھی کی تھی اب تک اس کے بیسیوں ایڈیشن نکل چکے ہیں اور بہت سے اصحاب نے

اس کو اوٹ کیا ہے۔ ہر ابراہیم گریرسن نے "لنگوسٹک سروے آف انڈیا"
میں اس کے مختلف ایڈیشنوں کی فہرست دی ہے جو نہایت طویل ہے۔
اس قصہ کی مقبولیت دیکھ کر پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد
خواجہ حیدر علی آتش نے ۱۲۵۴ھ میں نہال چند لاہوری کے ترجمہ کو نظم
کا جامہ پہنایا اور "گلزار نسیم" کے نام سے موسوم کیا۔ مثنوی گلزار نسیم کی تاریخ
تصنیف خود نسیم کے اس تاریخی قطعہ میں ملتی ہے۔

اس نامہ کہ خامہ کرد بنیاد — گلزار نسیم نام بنہاد
بشنید و نوید ہاتفے داد — توقیع قبول روز پیش باد
۱۲۵۴ھ

ان کی یہ مثنوی بھی بے حد مقبول ہوئی اور اب بھی اردو کی مثنویوں
میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔

نہال چند کی "مذہب عشق" چھبیس ابواب پر مشتمل ہے اور چونکہ ساری
کتاب میں ایک ہی طویل قصہ بیان کیا گیا ہے اور ہر باب میں اس کا
ایک حصہ یا داستان بیان ہوئی ہے۔ اس لیے ہر باب کو داستان
کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے نہال چند
لاہوری کی "مذہب عشق" شیخ عزت اللہ بنگالی کی فارسی کتاب کا ترجمہ
ہے۔ شیخ عزت اللہ نے ہندوستان کے فارسی اہل قلم اور اپنے معاصرین
کی طرح پر تکلف عبارت لکھی ہے۔ ان کے زمانہ میں بلکہ اس سے ایک
عرصہ دراز پہلے سے فارسی نثر نویسی میں ہر قسم کی لفظی آرائشات و تکلفات
داخل تھے اور کوئی بھی سلیس اور سادہ زبان لکھنا پسند نہیں کرتا تھا

جنتی کے اس زمانے کے معمولی اور نج کے خطوط بھی تکلفات لفظی سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ ہر موقع پر انشاء پردازی کا کمال دکھایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود شیخ عزت اللہ کو عبارت آرائی و لفاظی کا بے حد شوق تھا چنانچہ نہال چند نے ان کے ذکر میں لکھا ہے کہ "اس نے (شیخ عزت اللہ) آپ اس کا سبب یوں لکھا ہے کہ طالب علمی کے ایام میں اس فقیر کو انشاء پردازی کے فن میں رغبت تمام تھی اور مسودے بھی کاغذ پر لکھ لکھ کر چھوڑتا تھا"۔ اس سے ظاہر ہے کہ شیخ عزت اللہ کو انشاء پردازی اور پر تکلف عبارت لکھنے کی بڑی مشق اور شوق تھا اس لیے ان کا طرز بیان فارسی کے متاخر نثر نویسوں کی تمام خصوصیات سے معمور ہے نہال چند نے اپنے دیگر معاصرین کے برخلاف اردو ترجمہ میں اصل کتاب کے بہت سے فارسی الفاظ باقی رکھے ہیں اور زینت کلام کیلئے جو تکرار لفظی ہوئی تھی اس کو بھی برقرار رکھا۔ ان کا ترجمہ اصل سے بہت کم ہٹنے پایا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا طرز بیان ٹھیٹ اردو کی کتابوں کی طرح سادہ اور سلیس نہیں۔ جا بجا شاندار الفاظ اور فارسی کی ترکیبوں کے اردو ترجمے پائے جاتے ہیں۔ ترجمہ میں آزادی کو مطلق کام میں نہیں لایا گیا اور ساری کتاب پر فارسیت غالب ہے۔ بعض جگہ ہندی کے الفاظ بھی ہیں لیکن یہ جس زمانہ کی کتاب ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے بہت ہی کم ہیں۔ ان کے معاصرین میر امن، شیر علی افسوس اور مظہر علی ولا وغیرہ کی کتابوں میں ہندی الفاظ کا استعمال جس کثرت سے ہوا ہے اس کے مقابلہ میں ان کی تحریر کو ہندی الفاظ سے بالکل خالی سمجھنا چاہیے۔

اکثر دفعوں پر قصوں کے سلسلوں میں قطعات لکھے ہیں اور یہ غالباً
انہی کے ہیں مگر ان میں بھی تکلف اور آورد ہے۔ سادگی و صفائی مطلق نہیں
اس کے باوجود یہ کتاب بے حد مقبول ہوئی اور عوام الناس نے خوب
قدر کی۔ بظاہر اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق میں ہمیشہ سے
عجیب و غریب اور فوق العادت چیزوں سے رغبت رہی ہے اور ایسے ہی
قصوں کو ان کی زبان کی مشکلات کے باوجود لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ
لے لیا ہے۔ اس قصہ کا بھی یہی حال ہے۔ تاج الملوک اور بکاولی کا قصہ
پہلے ہی بے حد مقبول تھا اور جب اس کو اردو میں بیان کیا گیا تو پھر لوگوں نے
شوق سے خریدنا شروع کیا اور اس کو متعدد بار چھاپنے کی ضرورت پڑی
مذہب عشق کا ایک نمونۂ عبارت ملاحظہ ہو:۔

"جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاولی چھین لیا
اور وہ بے چارہ دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ مثل ہے کہ قہر درویش
بجان درویش" پھر کج فہموں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے
اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا
اُس میں جا پہنچا اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیے ہوئے
بال کو اس پر رکھ دیا۔ چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار
دیوؤں سمیت آ پہنچی۔ اور تاج الملوک کو فقیروں
کے بھیس میں دیکھ کر آگ ہو گئی کہ اے شہزادے
میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے [illegible] کیا بنایا۔ تاج الملوک

بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے لیکن ایک کام
مجھے نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں
ہوسکتی۔ اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے۔ حمالہ نے کہا کہ لے
عیار باتیں نہ بنا وہ کون کام ہے جلدی کہہ۔ تاج الملوک نے
عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہو بہو
بکاؤلی کے قصر اور باغ سا ہو بناؤ۔ تم جس طرح جانو جلد بنوا دو۔
وہ بولی اے بیٹا یہ کتنی بڑی بات ہے۔ مگر میں نے اس باغ اور
عمارت کو دیکھا نہیں بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں
اور بنوا دوں۔ تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح
بنوا دو۔ حمالہ نے اسی وقت کئی سو دیو لعل بدخشانی کے
اور سیکڑوں عقیق یمانی کے لیے اور ہزاروں روپے اور جواہر
بیش قیمت کے واسطے ہر چہار طرف بھیجے۔ دیوؤں نے تین روز
کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ کے جابجا تودے لگا دیے۔ پھر
شہزادہ جس طرح بتلانے لگا اسی طرح وہ بنانے لگے۔ پہلے تو
دو دو نیزے مٹی کھود کر پھینکدی اور وہاں زرِ خالص بھر دیا
اور اس قطعہ طلائی پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔ غرض تھوڑے
دنوں میں ویسا ہی قصر اور اس طرح کا باغ جواہر نگار جڑاؤ بہترین درختوں
سمیت اور زبرجد اور یاقوت کے دو دالان عالیشان آمنے سامنے
بیچ میں ان کے ایک حوض مرصع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا پھر

ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔ حاصل یہ کہ جتنا جواہر سوتا روپیہ دیولائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔ چوتھائی کارخانہ جات کی تیاری کو دیدیا اور باقی خزانہ میں داخل کیا۔"
(مذہب عشق مطبوعہ لکھنؤ ص ۳۳)

اگرچہ اس وقت نہال چند یا ان کی کتاب "مذہب عشق" کی کما حقہ قدر نہیں کیجاتی ہے کیونکہ نہ تو نہال چند کے طرز بیان میں کوئی ایسی خاص دلکشی ہے کہ اردو بولنے والے ہمیشہ اس کے گرویدہ بنے رہیں اور نہ مذہب عشق ہی کا قصّہ اس زمانہ میں لوگوں کی ضیافت طبع کا کچھ سامان بہم پہنچا سکتا ہے اب اردو نے ترقی کے اتنے مدارج طے کر لیے ہیں اور اس میں لٹریچر کا اتنا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے کہ مذہب عشق اور اس کے ساتھ کی دیگر کتابوں سے لوگوں کا دلچسپی لینا ممکن نہیں مگر فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم نے اردو نثر کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اردو نثر نویسی کے ابتدائی اور دشوار گزار مراحل کو جن محنتوں سے طے کر کے آنے والوں کے لیے راستہ صاف کیا ہے وہ ایسی نہیں کہ اردو بولنے والی نسلیں ان کو بھلا دیں۔ ہمارے ان پیشروان نثر میں نہال چند بھی ہیں اور اس لحاظ سے توجہ اور مطالعہ کے مستحق ہیں۔ ان کی قدامت ہی ان کی زندگی اور کارنامے کو اہمیت دیتی ہے۔

منشی بینی نارائن جہاںؔ

فورٹ ولیم کالج کے ارباب قلم میں منشی بینی نارائن المتخلص بہ جہاں نہایت غیر معروف مولف ہیں بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف ہیں انکے کارنامے یقیناً قابل قدر ہیں مگر بدقسمتی سے اس وقت تک ایک کو بھی طباعت و اشاعت نصیب نہ ہو سکی۔ جہاں کوئی بلند پایہ شاعر نہ تھے اس لیے کسی تذکرے اور تاریخ میں ان کا ذکر نہیں البتہ منشی کریم الدین مولف طبقات الشعرائے ہند نے اپنے تذکرے میں سرسری طور پر چند سطریں لکھدی ہیں جو موجودہ حالت میں بہت غنیمت ہیں۔

بینی نارائن لاہور کے ایک معزز اور علم دوست خاندان کے رکن تھے ان کے والد مہاراجہ لکشمی نارائن ایک متمول رئیس اور بڑے بھائی رائے لکھم نارائن اچھے خاصے عالم اور شاعر تھے ان کا تخلص رند تھا۔ بینی نارائن نے اپنی کتابوں کے دیباچوں وغیرہ میں اپنا جو ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے۔ ان کی پیدائش اور تعلیم و تربیت لاہور ہی میں ہوئی۔ گردش زمانہ سے وہ بہت تباہ حال اور تنگدست ہو گئے اور چند ہی روز میں آسمانی سلطانی آفتوں نے امارت و تمول سے محروم کر کے تلاش معاش کے لیے آوارہ وطن کر دیا۔ پے در پے پریشانیاں اٹھا کر بالآخر وطن کو خدا حافظ کہا اور آپ دانہ

کی تلاش میں کئی سال ہندوستان کے مختلف شہروں کی سیاحت کرتے ہوئے کلکتہ جا پہنچے۔ ان کے کلکتہ آنے کا باعث فورٹ ولیم کالج کے قیام اور وہاں اہل قلم کی قدردانی و پرورش کی خبریں تھیں۔ جسوقت یہ کلکتہ پہنچے فورٹ ولیم کالج کا دورِ اول گزر چکا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ جو اس کالج کے روحِ رواں اور مولفوں کے بہت بڑے سرپرست تھے اس کی صدارت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن کو واپس ہو چکے تھے۔ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے کالج کے دائرہ عمل کو محدود کرنا شروع کر دیا تھا اور وہاں نئے اہل قلم کی سرپرستی و اعانت کا کوئی سامان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بینی نارائن کلکتہ پہنچتے ہی کوئی عمدہ خدمت حاصل نہ کرسکے اور انکو نووارد سمجھ کر کسی نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ غرض یہاں بھی بارہ برس کا زمانہ دراز عسرت و پریشانی میں بسر ہوا۔ اس عرصہ میں انہوں نے کالج کے مشہور ارباب قلم اور مولفین سے راہ و رسم پیدا کرلی اور خصوصاً سید حیدر بخش حیدری سے ان کا ربط ضبط بڑھ گیا۔ ان ہی کی سفارش سے بینی نارائن کو کپتان ٹامس روبک کے ہاں باریابی کا موقع ملا۔ کپتان موصوف نے ان کو کالج کے ارباب قلم میں ملازم رکھ لیا اور تصنیف و تالیف کا کام لینے لگے۔

کالج کی سلک ملازمت میں داخل ہو کر بینی نارائن نے دو کتابیں تالیف کی ہیں (۱) "چار گلشن" اور (۲) "دیوان جہان"۔ گارسان دتاسی نے لکھا ہے کہ انہوں نے اس کے علاوہ مولوی شاہ رفیع الدین صاحب

کی فارسی کتاب تنبیہ الغافلین کا بھی ۱۲۴۵ھ میں اردو ترجمہ کیا ہے گارساں دی تاسی ہی کا بیان ہے کہ بینی نارائن نے مذہب اسلام قبول کرلیا تھا اور مشہور مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ اس بیان میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں بینی نارائن کا ترجمہ تنبیہ الغافلین موجود ہے جس سے یہ بیان بالکل مصدقہ ہو جاتا ہے۔ ان کی تاریخ وفات کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔ البتہ گارساں دی تاسی کے مذکورۂ بالا بیان کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲۴۵ھ کے بعد وفات پائی ہوگی۔

بینی نارائن کی کتابوں کو افسوس ہے کہ طباعت واشاعت کا موقع ہی نہیں ملا اور اب تک وہ مسودہ کی صورت میں پڑی ہوئی ہیں خوش قسمتی سے یہ مسودے اب نہایت ہی حفاظت میں ہیں ورنہ ایسی چیزوں کا جن کو شایع ہونے کا موقع ہی نہ ملا ہو دست بروزمانہ سے بچ رہنا بہت مشکل ہے۔ ان کی مولفات میں سب سے زیادہ اہم چیز "تذکرۂ دیوان جہاں" ہے اور اس وقت اس کی اشاعت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اس میں انھوں نے اپنے اکثر معاصر شعراء کا ذکر کیا ہے جو شاعری کی وجہ سے تو نہیں مگر نثر نویسوں کی حیثیت سے بہت ممتاز ہیں اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے ان کی طرف سے بالکل بے اعتنائی برتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر یہ تذکرہ شایع ہو جائے تو اس سے اردو نثر نویسی کے پیشروؤں کے حالات پر بہت

کچھ روشنی پڑنے کی توقع کی جا س[...]

چار گلشن یہ بینی نارائن کی سب [...] تالیف ہے یہ ایک عشقیہ قصہ ہے اور اس میں [...] جوان اور فرخندہ کے عشق و محبت کی داستان بیان کی گئی [...] ۔ مؤلف نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس قصہ کا پلاٹ ایک زمانہ دراز سے اس کے ذہن میں تھا ۔ ایک مرتبہ ۱۲۲۵ھ م ۱۸۱۰ء میں انھوں نے یہ قصہ مولوی امام بخش کو سنایا تو انھوں نے بے حد پسند کیا اور اس کو سلیس نثر میں لکھنے پر زور دیا ان کے ایما و اصرار سے یہ قصہ لکھا گیا اور کالج کے انگریز عہدہ دار کپتان ٹامس روبک اور کپتان ولیم ٹیلر کو دکھایا گیا تو انہوں نے پسندیدگی ظاہر کی اور مولف کو کافی صلہ دے کر اس سے مسودہ حاصل کر لیا ۔ یہ کالج کے کتب خانہ میں رکھا گیا ۔ یہ قصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد فارسی زبان کے کسی قدیم قصہ پر رکھی گئی ہے گارساں دتاسی نے اس کو ہلالی کے قصہ "شاہ و درویش" کا ترجمہ بتایا ہے مگر یہ سراسر غلط ہے ۔ ہلالی کا قصہ اس سے بالکل مختلف ہے ۔ مولف نے اس کا نام حسب ذیل بیت میں نظم کر دیا ہے ۔

رکھا چار گلشن جو میں اس کا نام — رہے گی خزاں دور اس کے مدام

یہ قصہ اب تک شائع نہیں ہوا ۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ محفوظ ہے جو غالباً کتب خانہ فورٹ ولیم کالج کا ہی [...] بینی نارائن کی یہ تالیف بہ حیثیت قصہ نہیں بلکہ بہ حیثیت ایک قدیم نثری کتاب ہونے

کے ضرور قابل قدر ہے' باغ و بہار' باغ اردو' آرائش محفل کی طرح یہ بھی اردو کی ابتدائی کتب نثر میں ہے اور تاریخ ادبیات اردو میں اس سلسلہ کی ایک کڑی ہونے کی وجہ سے بہت کچھ اہمیت رکھتی ہے۔ برٹش میوزیم میں جو نسخہ ہے وہ نہایت خوشخط اور صحت و احتیاط سے رقم ہوا ہے ذیل میں اس کا ایک اقتباس درج کیا جاتا ہے جو ہمارے عنایت فرما ڈاکٹر زور صاحب نے نقل کر کے بھیجا ہے۔

زمانہ گذشتہ کے نقل کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتۂ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ' نہایت عالیشان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اسکو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کرسکتا تھا اور اس کے داب رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا۔ ہیبت فلک مرتبت تھا۔ وہ کیوان شاہ روشن فروز اس کے تھے مہر و ماہ۔ ایک دن وہ بادشاہ قلعہ کے جھروکے میں بیٹھا ہوا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ بہت آدمی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو رہے تھے گزارے کی کشتیاں آدمیوں سے بھری ہوئیں اُدھر سے ادھر اور ادھر سے اُدھر آتی جاتی تھیں۔ (چار گلشن قلمی ص۱۱)

دیوان جہاں

بینی نارائن کی دوسری اور مفید تالیف تذکرہ "دیوان جہاں" ہے یہ کپتان روبک کے ایما سے لکھا گیا ہے اور کالج کی طرف سے تیسرا تذکرہ ہے۔ اس سے قبل کالج کے دو اہل قلم مرزا علی لطف اور سید حیدر بخش حیدری شعرائے اردو کے تذکرے لکھ چکے تھے ان میں سے لطف کا تذکرہ تو ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے لکھا گیا اور حیدری نے اپنے طور پر مرتب کیا۔ حسن اتفاق سے ان دونوں کے نام "گلشن ہند" ہیں۔ حیدری کا گلشن ہند کسی قدر ناقص اور مسودہ کی صورت میں پڑا رہا۔ اور لطف کا تذکرہ حسن اتفاق سے شایع ہو گیا مگر اس میں صرف مشاہیر شعرا کا ذکر ہے اور غیر معروف شاعروں کو جگہ نہیں دی گئی ان کے لیے وہ دوسری جلد لکھنے والے تھے۔ معلوم نہیں کہ وہ اس کی تکمیل کر سکے یا نہیں۔ یورپ اور حیدرآباد میں لطف کے "گلشن ہند" کے قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی دوسری جلد شامل نہیں ہے ممکن ہے کہ غیر معروف شعرا کے متعلق کچھ لکھنے نہ پائے ہوں۔ علاوہ ازیں ان کا طرز بیان اسقدر پیچیدہ اور پر تکلف ہے کہ عوام الناس اور وہ نو وارد انگریز جنہیں اردو میں نوشت و خواند کی تھوڑی سی صلاحیت ہوتی تھی اور جن کے لیے یہ تذکرہ تالیف کرایا گیا تھا اس سے کما حقہ مستفید نہیں ہو سکتے تھے۔ غالباً اسی لیے یہ تذکرہ کالج کی طرف سے شایع نہیں کیا گیا اور کپتان روبک نے ایک اور تذکرہ کی ضرورت محسوس کر کے جہاں سے لکھوایا۔

ڈاکٹر اسپرنگر نے اس کی تاریخ تالیف سنہ ۱۲۲۷ھ سنہ ۱۸۱۲ء بتائی ہے مگر

خود مؤلف تذکرہ نے اسکی تاریخ اختتام ۱۲۲۹ھ م ۱۸۱۴ء لکھی ہے
غالباً اس کی تالیف ۱۲۲۷ھ میں شروع ہوئی اور دو سال میں اتمام کو پہنچی۔
اس تذکرہ میں (۱۲۵) شعرا کا اجمالی ذکر کیا گیا ہے قدیم تذکروں کی طرح
اس کی ترتیب حروف تہجی پر رکھی گئی ہے۔ شعرا کے حالات میں اکثر صرف
نام، ولدیت، سکونت و تلمذ وغیرہ پر اکتفا کیا ہے اور تاریخ ولادت و
وفات اور دیگر ضروری امور نہیں بیان کیے گئے۔ یہ بات اردو کے تقریباً
تمام قدیم تذکروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور تقریباً تمام
تذکرہ نویسوں نے حالات فراہم کرنے میں بالکل بے توجہی سے کام
لیا ہے۔ دیگر تذکروں کی طرح اس میں بھی ہر شاعر کے ذکر کے ساتھ اس کا
مختصر سا کلام بطور نمونہ نقل کر دیا گیا ہے۔ مولف نے اس میں اپنا بہت
کلام شریک کر دیا ہے اور کتاب کے آخر میں اپنی رباعیوں قطعوں
اور ابیات کا مجموعہ بھی داخل کر کے اس کا حجم بڑھا دیا ہے۔ گویا یہ ان کا
دیوان بھی ہے اور شعرائے اردو کا تذکرہ بھی، اور غالباً اسی مناسبت
سے اس کا نام "دیوان جہاں" رکھا گیا ہے۔ اس کا دیباچہ بھی نظم میں ہے۔
یہ تذکرہ بالکل نایاب چیز ہے۔ برٹش میوزیم میں اس کا ایک قلمی نسخہ ہے اور غالباً
یہی نسخہ محفوظ ہے ہمیں اپنے دوست ڈاکٹر زور صاحب کی
عنایت سے ایک نقل حاصل ہوئی ہے۔ چند شاعروں کا ذکر نمونتاً درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

ولی تخلص نام میرزا محمد ولی معروف آگاہ شاہ اسرار اللہ کے
بھتیجے دکن کے رہنے والے۔ یہ ان سے ہے۔

اس کتاب کے بعد ترجمہ ہی کی شہرت ہوئی ہوگی - مگر نہیں کہا جا سکتا کہ
وہ طبع بھی ہوا یا نہیں - آج کل تنبیہ الغافلین اردو کے جو مطبوعہ نسخے
ہیں وہ یقیناً بینی نارائن کے نہیں ہیں - بینی نارائن کے ترجمہ میں صر[illegible]
(۳۰) ابواب ہیں اور موجودہ نسخوں میں (۲۵) ابواب پائے جاتے [illegible]
ترجمہ سید محمود، محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی سعی [illegible]
ہے - ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز اور مولوی امیر الد[illegible]
یہ ترجمہ مرتب کیا ہے - اس میں کہیں بھی بینی نارائن [illegible] نے کا ذکر
نہیں البتہ یہ فقرہ موجود ہے "اس کتاب کا نام تنبیہ [illegible]لین ہے اور
احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے [illegible] کو جس میں (۲۱) با[illegible]
تھے فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا لیکن اک[illegible] الفاظ اس کے
بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں" معلوم ہوتا ہے
کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بینی نارائن ہی کا
آیتوں اور حدیثوں سے غلطیاں رہ جانے سے بھی اس خیال کی
تائید ہوتی ہے - نیز اس ترجمہ کو ہندی زبان میں بتانا بھی یہ امر ثابت
کرتا ہے کہ اس سے مراد انہی کا ترجمہ ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم اور
اس زمانہ کے اکثر مصنفوں کی کتابوں میں اُردو کی جگہ ہندی کے نام سے یاد
کیا گیا ہے اور کہیں بھی اردو کا لفظ نہیں لکھا گیا علاوہ ازیں بینی نارائن ہی کا
ترجمہ (۲۰) ابواب پر مشتمل ہے - ذیل میں تنبیہ الغافلین کا نمونہ عبارت دیا جاتا ہے
جو مکرمی زور صاحب کی عنایت سے انڈیا آفس کے نسخہ سے دست

محفوظ ہے اس کے آخر میں ایک گلدستہ غالباً ۲۵ جولائی ۱۸۱۵ء کے مشاعرہ کا ہے۔ اس میں مندرجۂ ذیل شعراء کی غزلیں ہیں ان میں سے بعض تو فورٹ ولیم کالج سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کلکتہ کے پیشہ ور شاعر تھے۔

۱۔ جوآں ۔ مرزا کاظم علی دہلوی　　۲۔ حیدری ۔ سید حیدر بخش دہلوی
۳۔ شہرت ۔ افتخار الدین علیخاں　　۴۔ رواں ۔ سید جعفر علی لکھنوی
۵۔ عیاں ۔ مرزا ہاشم علی پسر خرد جوآں　　۶۔ قاسم ۔ ابوالقاسم خاں دہلوی
۷۔ ممتاز ۔ مرزا قاسم علی پسر کلاں "　　۸۔ ولا ۔ مظہر علی دہلوی

تنبیہ الغافلین بینی نارائن کا تیسرا کارنامہ تنبیہ الغافلین کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلویؒ خلف الرشید مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ کی ایک فارسی تالیف ہے اردو کے لحاظ سے آپ کی متعدد تالیفوں میں قرآن مجید کا اردو ترجمہ نہایت اہم کتاب ہے۔ شمالی ہند میں سب سے پہلے آپ نے ہی اردو زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ فرمایا ہے آپ نے کتاب تنبیہ الغافلین مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے ایما سے عامۃ المسلمین کے فایدہ کے لیے سلیس فارسی میں تالیف فرمائی تھی یہی مولوی سید احمد صاحب بینی نارائن کے پیر و مرشد تھے۔

بینی نارائن کا ترجمہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ۱۲۴۵ء میں تمام ہوا اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ ظاہر ہے

اس کتاب کے بعد ترجمہ ہی کی شہرت ہوئی ہوگی - مگر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ طبع بھی ہوا یا نہیں۔ آج کل تنبیہ الغافلین اردو کے جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں وہ یقیناً بینی نارائن کے نہیں ہیں۔ بینی نارائن کے ترجمہ میں صرف (۳۰) ابواب ہیں اور موجودہ نسخوں میں (۲۵) ابواب پائے جاتے ہیں مطبوعہ ترجمہ سید محمود، محمد طیب، امین الدین اور محمد تقی کی مساعی کا نتیجہ ہے - ان لوگوں نے مولوی عبدالعزیز اور مولوی امیرالدین کی تصحیح سے یہ ترجمہ مرتب کیا ہے۔ اس میں کہیں بھی بینی نارائن کے ترجمہ کرنے کا ذکر نہیں البتہ یہ فقرہ موجود ہے "اس کتاب کا نام تنبیہ الغافلین ہے اور احوال اس کتاب کا یوں ہے کہ پہلے کسی شخص نے اس کو جس میں (۳۰) باب تھے فارسی سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا تھا لیکن اکثر الفاظ اس کے بے محاورہ اور نادرست اور آیتیں اور حدیثیں غلط تھیں" معلوم ہوتا ہے کہ جس ہندی ترجمہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ بینی نارائن ہی کا ہے آیتوں اور حدیثوں سے غلطیاں رہ جانے سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے - نیز اس ترجمہ کو ہندی زبان میں بتانا بھی یہ امر ثابت کرتا ہے کہ اس سے مراد انہی کا ترجمہ ہے کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم اور اس زمانہ کے اکثر مصنفوں کی کتابوں میں اُردو کی جگہ ہندی کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور کہیں بھی اردو کا لفظ نہیں لکھا گیا علاوہ ازیں بینی نارائن ہی کا ترجمہ (۳۰) ابواب پر مشتمل ہے - ذیل میں تنبیہ الغافلین کا نمونہ عبارت دیا جاتا ہے جو مکرمی زور صاحب کی عنایت سے انڈیا آفس کے نسخہ سے بہ دست

ہوا ہے :-

بنی اسرائیل سے ایک جگہ تین بھائی تھے ان میں ایک بڑا دانا تھا اس نے اپنے بھائیوں سے کہا اے بھائیو ماں باپ کی خدمت ہم کو سپرد کرو تو ہم بجا لائیں۔ بعد مرنے کے جب میراث ان کی ملیگی تم دونوں ہی بانٹ لیجو۔ یہ بات سن کے وہ بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ الغرض وہ اکیلا خدمت ان کی کرنے لگا جب ماں باپ ان کے مر گئے یہ دونوں بھائی ورثہ ان کا پا کر خوش گزران کرنے لگے اور بڑے بھائی کو اس مال سے کچھ نہ دیا۔ اس نے چھوٹے بھائیوں سے کہا اے بھائیو جیسا ماں باپ کے وقت میں کھانے پینے کو پاتا تھا ایسا ہی اب مجھ کو دو۔ بس اور کچھ نہیں مانگتا ہوں۔ اس کی زوجہ یہ بات سنکے قضیہ کرنے لگی۔ ایک رات اس بیچارے نے خواب میں دیکھا کہ ایک آدمی کہتا ہے فلانی جگہ سو دینار سونے کے گڑے ہیں تو نکال لے اس نے اعتبار نہ کیا۔ آخر یہی بات تین رات پیہم خواب میں دیکھا کیا بعد اس کے جواس جگہ کو کھودا تو وہ دینار پائے۔ (تنبیہ الغافلین قلمی ص ۲۲۴)

چلے جانے کے ایک عرصہ بعد بھی وہیں ملازم اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے
اردو نثر میں ان کا کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ موجودہ معلومات سے
صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک مشہور اور عام طور پر مقبول مرثیہ گو تھے۔

جیسا کہ ہم نے آگے اس کا ذکر کیا ہے گریرسن[۱] کا بیان ہے کہ ڈاکٹر
گل کرسٹ کی "بیاض ہندی" کی تالیف میں مسکین ان کے شریک کار تھے۔
یہ کتاب زیادہ تر کالج کے ارباب قلم کی تصانیف و تراجم کے انتخابات پر
مشتمل ہے اس کی تدوین و انتخاب میں مسکین نے بھی بڑا حصہ لیا ہے
ممکن ہے کہ اس میں ان کا بھی کوئی مضمون یا نثری قطعہ عبارت شریک
ہو۔ اس کتاب کا ایک ہی ایڈیشن شایع ہوا تھا دوبارہ چھپنے کی نوبت
نہیں آئی۔ ہماری نظر سے یہ کتاب نہیں گزری اور نہ کہیں اس کا
موجود ہونا معلوم ہوا۔

میر عبداللہ مسکین کا بڑا اور مشہور کارنامہ ان کے مراثی ہیں۔ کریم الدین
کا بیان ہے کہ مسکین نے زیادہ تر مرثیے ہی کہے ہیں دیگر اصناف سخن
میں ان کا کلام بالکل کم ہے۔ یوں تو وہ مشہور مرثیہ گو ہیں اور ان کے
مرثیے عوام میں بہت مقبول اور رائج تھے۔ مگر ایک طویل مرثیہ جو حضرت
مسلم رض بن عقیل رض اور آپ کے صاحبزادوں کی شہادت پر لکھا گیا تھا
بے حد مقبول ہوا۔ علاوہ اردو میں شایع ہونے کے دیوناگری رسم الخط میں
بھی اس کا ایک ایڈیشن سنہ ۱۸۰۲ء میں نکلا اور ہاتھوں ہاتھ بک گیا جس طرح
میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کو "نثر بے نظیر" کے نام سے

۱؎ لنگ وسٹک سروے آف انڈیا (گریرسن) ص ۱

اُردو نثر میں لکھا تھا۔ اس مرثیے کے مضمون کو بھی نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کو نثر کا لباس کس نے پہنایا خود سکین نے اس کی نثر کی یا کسی دوسرے معاصر اہل قلم نے اس کی مقبولیت عام کے مد نظر اس کو نثر میں لکھ دیا۔

سکین کے مراثی کا ایک اچھا خاصا دیوان ترتیب پایا تھا اسپرنگر نے کتب خانہ شاہان اودھ میں اس کا ایک نسخہ ہونا بتایا ہے۔ اس کا نام مجموعہ مرثیہ ہائے سکین لکھا ہے اس ایک نسخہ کے علاوہ کہیں اور سکین کا مجموعہ مراثی نہیں پایا جاتا۔

اردو کے مشہور فرانسیسی پرستار گارساں دی تاسی نے جو ہندوستان سے کوسوں دور رہنے کے باوجود اپنے عہد کی ہر ایک اردو تحریر اور تصنیف و تالیف سے باخبر رہتے تھے۔ فرانسیسی میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۸۴۵ء میں پیرس سے شائع ہوا تھا۔

طبقات الشعرائے ہند میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈاکٹر گل کرسٹ نے اپنی قواعد اردو میں سکین کے کلام سے بہت سے اشعار نقل کیے ہیں۔ غالباً اصطلاحات صرف و نحو کی مثالوں میں زیادہ تر ان کے عام پسند اشعار کو نقل کر لیا گیا ہے۔ طبقات الشعرائے ہند میں ان کے کلام کا نمونہ نہیں ہے مگر "بہت مشہور شاعر" بتایا گیا ہے۔

للّولال کوی

سری للّو لال ہندی زبان کے مشہور عالم اور شاعر ہیں۔ یہ بھی ڈاکٹر گل کرسٹ کے زمانۂ صدارت میں فورٹ ولیم کالج میں ملازم اور ہندی کتابوں کی تصنیف و تالیف کی خدمت پر مامور تھے۔ فورٹ ولیم کالج کی مساعی اردو نثر سے ان کا تعلق اگرچہ براہ راست کچھ نہیں رہا۔ اور ان کی تالیفات تقریباً تمام برج بھاشا میں ہیں۔ لیکن وہ کالج کے دوسرے منشیوں کو ہندی کتابوں کے ترجمہ کرنے میں بڑی مدد دیتے رہے اور کالج کی سرپرستی میں بعض عمدہ ہندی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ علاوہ ازیں ان کی ہندی تحریر بھی نہایت صاف و شستہ تھی۔ اگر اس کو فارسی رسم الخط میں لکھا جائے تو اس کو اردو تحریر ہی کہا جائیگا اس لیا سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ کی بے جا بھرمار نہیں ہے۔

للّولال کا خاندان ابتداً گجرات میں آباد تھا لیکن وہ گجرات سے ترک وطن کر کے ایک مدت سے شمالی ہند میں آبسے تھے ان کے حالات زندگی بالکل پردۂ تاریکی میں ہیں صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ ذات کے برہمن تھے اور بچپن ہی سے شمالی ہند میں بود و باش اختیار کرنے کی وجہ سے برج بھاشا سنسکرت اور دیگر پراکرت زبانوں پر عالمانہ قدرت رکھتے تھے۔

ہندی ادبیات میں للّولال کی تالیفات خاص طور پر اہم اور عہد آفریں

سمجھی جاتی ہیں وہ معیاری یا اعلیٰ و فصیح ہندی کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں[1] ان کے ساتھ ایک اور ہندی زبان کے ماہر سدل مصر ابھی فورٹ ولیم کالج میں تھے ان دونوں نے ہندی زبان میں نثر نویسی کا میدان صاف کیا اور اپنی کتابوں کے ذریعہ زبان و طرز بیان کا ایسا پسندیدہ نمونہ پیش کیا کہ متاخر ہندی اہلِ قلم نے اسی پر اپنی تحریروں کی بنیاد رکھی ان دونوں نے اس زمانہ کے عام اردو مولفین کے برخلاف اردو تحریر سے عربی فارسی کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ نکال کر ان کی جگہ سنسکرت کے کم اور برج بھاشا کے زیادہ سلیس اور عام فہم الفاظ داخل کیے اور اپنی کتابیں دیو ناگری رسم الخط میں لکھ کر ہندی نثر نویسی کے اعلیٰ نمونے قوم کے آگے پیش کیے انکی مساعی جیسا کہ ہندی ادبیات کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں نہایت کامیاب ہیں ہندی نثر نویسی میں ان کو مجدد اور مخترع کا درجہ حاصل ہے۔ سدل مصر نے للولال کے ادبی مددگار اور صرف ایک ہندی قصہ کے مؤلف ہیں البتہ للولال کی تالیفات زیادہ اور مختلف قسم کی ہیں۔ ذیل میں ان کی مختصر سی کیفیت درج کی جاتی ہے۔

پریم ساگر یہ بھگوت گیتا کے دسویں باب کا ترجمہ ہے برج بھاشا میں اس کو ایک اور پنڈت چتر بھوج مصر نے بھی لکھا ہے للولال نے اس نسخہ سے ثقیل سنسکرت الفاظ اور غیر مانوس قدیم ترکیبیں خارج کر کے از سرنو ایک کتاب مرتب کی۔ پریم ساگر میں ہندوؤں کے مشہور دیوتا سری کرشن جی کی روایتی تاریخ اور دیگر حکایات بیان کی گئی ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرے ایڈیشن

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی از یف۔ ای۔ کئی ص۸۵

۱۸۰۴ء و ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۵ء میں شائع ہوئے۔ للّو لال کی یہ کتاب بہت مقبول رہی۔ ہندوستان اور یورپ کے ہندی داں طبقہ نے اس کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا۔ انگریزی میں بھی اس کے دو ترجمے ہوئے ہیں ایک کپتان ولیم ہولنگس نے ۱۸۴۸ء میں کلکتہ سے شایع کیا اور دوسرا ایڈورڈ ایسٹ وک نے لندن سے ۱۸۶۷ء میں۔

راج نیتی للّو لال کی تالیفات میں یہ کتاب بھی خوب مشہور رہوئی۔ اس میں قصص و حکایات کے پیرایہ میں ہندوؤں کے اصول اخلاقیات اور فوجی و غیر فوجی پالیسی اور طرز حکومت وغیرہ مختلف امور پر بحث کی گئی ہے۔ پریم ساگر کی طرح اس کی زبان بھی نہایت فصیح ہندی ہے۔ یہ کتاب ابتدائً سنسکرت میں نارائن پنڈت نے لکھی تھی۔ راج نیتی کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۹ء میں کلکتہ سے شایع ہوا بعد میں متعدد ایڈیشن طبع ہوئے۔ ایک عرصہ تک یہ کتاب ہندی کے نصاب میں داخل تھی۔

سبھا بلاس یہ ہندی کی چیدہ اور دلکش نظموں کا مجموعہ ہے جو کالج کے طلبائے ہندی کے لیے بطور انتخاب نظم مرتب کیا گیا تھا۔ ہندی دوہے اور گیت عوام میں جب پسندیدگی کی نظر دل سے دیکھے جاتے ہیں اس کی وجہ سے یہ مجموعہ خوب مشہور ہوا اس کا پہلا ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۲۹ء میں کالج کے ایک انگریز پروفیسر کپتان ایم پرائس نے ایک اور ایڈیشن چھاپا تھا۔ گلبرٹ سن نے سنہ ۱۹۰۰ء

میں بنارس سے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع کیا۔

مہادیو بلاس یہ ایک منظوم افسانہ عشق و محبت ہے اس میں مہادیو اور سلوچن کے عشق و عاشقی کے حالات نظم کیے گئے ہیں یہ فسانہ سنسکرت میں تھا للّولال نے برج بھاشا میں نظم کردیا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا پہلا ایڈیشن کب نکلا۔ آگرہ سے ایک ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں شایع ہوا تھا ازاں بعد متعدد ہندی مطبعوں میں یہ نظم چھپی اور اس کا بھی بہت چرچا رہا۔

لطائف ہندی یہ ہندوستانی لطائف اور ظریفانہ کہانیوں کا مجموعہ ہے ابتداً فارسی اور ہندی دونوں رسم الخط میں شائع ہوا تھا۔ اس میں متعدد برمحل امثال، ضلع جگت، ریختہ اور برج بھاشا کے صنائع اور لفظی تکلفات ہیں اس میں اردو انگریزی الفاظ کی ایک فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ اس کا آدھا حصہ جو ہندی سے متعلق ہے للّولال کا کارنامہ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۱۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۸۲۱ء میں کلکتہ سے ایک اور ایڈیشن ولیم کارمیکل اسمتھ نے شائع کیا تھا۔ اس میں سے ناگری رسم الخط کا حصہ خارج کردیا گیا۔

سنگاسن بتیسی پریم ساگر اور راج نیتی کی طرح للّولال کا ایک مشہور کارنامہ "سنگاسن بتیسی" بھی ہے اس کی بنیاد بھی سنسکرت کے کسی قدیم قصہ پر رکھی گئی ہے للّولال نے ہندی میں اس کا بہ تغیر الفاظ و تراکیب صاف ترجمہ کرکے دیوناگری خط میں شائع کرایا تھا اس کی

مقبولیت اس قدر زیادہ ہوئی کہ اردو رسم الخط میں بھی یہ کتاب کئی بار چھپ چکی ہے اردو رسم الخط کا ایک نسخہ ہمیں ملا ہے اس سے ایک چھوٹی سی حکایت نقل کی جاتی ہے یہ اصل ہندی عبارت ہے صرف رسم الخط بدل دیا گیا ہے اس میں اگرچہ ہندی الفاظ کی کثرت ہے اور فارسی وعربی کے لفظ بہت کم نظر آتے ہیں تاہم یہ اتنی مشکل نہیں کہ اردو دان حضرات اس سے بالکل لطف اندوز نہ ہوسکیں۔ اردو ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے بیجا تعصب قومی سے دور رہ کر ثقیل و نامانوس الفاظ عربی و فارسی اور سنسکرت کے استعمال نہ کریں اور زبان کی قدرتی ساخت اور رفتار کے موافق ہندی اور فارسی کے سلیس الفاظ پر تحریر کا انحصار رکھا جائے تو یقیناً اردو سارے ہندوستان کی مقبول عام زبان بنجائیگی اور اردو ہندی کا وہ بڑا جھگڑا مٹ جائیگا جو ہندو مسلمانوں میں اجنبیت پیدا کرانے کا موجب اور ان کے سیاسی اتحاد کی راہ میں بھی بری طرح حائل ہے۔

ایک روز ایک پنڈت کہیں راجہ بکرماجیت کے پاس آیا اور اس نے آن کر بیان کیا کہ جو کوئی محل بنانے کی بنا موافق میرے کہنے کے دھرے بہت چین اٹھاوے اور بڑا نام پاوے تب راجہ نے کہا اچھا ظاہر کر برہمن کہنے لگا جب تلا لگن آوے جب اس میں مندر اٹھاوے جب تک وہ لگن رہے تب تک کام اس میں جاری رکھے اور جب تلا لگن ہو چکے تب اس کا کام موقوف کر دے۔ اسی طرح

تلالگن میں ہی وہ سارا مکان تیاری پر لاوے اس کا آ ٹوٹ بھنڈارہ ہو اور کبھی اس کے یہاں سے کبھی نہ جائے یہ بات سنکر راجہ من میں خوش ہوا دیوان کو بلایا اور مندر اٹھانے کی اجازت دی کہ تم اچھی جگہ ڈھونڈھ کر محل بناؤ۔ اتنے میں تلالگن بھی آن پہنچی اس مندر کی نیو دی۔ دیس دیس میں یہ ادا ہوئی کہ راجہ تلالگن میں محل بنواتا ہے جتنے کاریگر اس میں کام کرتے تھے وے اُٹھ کر تلالگن میں بناتے تھے ۔ کہیں کام اس میں سونے کا اور کہیں روپے کا اور کہیں لوہے کا اور کہیں کاٹھ کا نئی نئی طرح سے بنتا تھا ۔ چنانچہ دریا کے کنارے پر وہ حویلی بنائی ۔ چار دروازے اور سات کھنڈ اس میں رکھے جگہ جگہ جواہر انمول اس میں جڑے اور دروازہ پر دو نیلم کے بڑے نگینے لگائے جو کسی کی نظر نہ لگے۔ وہ جڑاؤ محل کتنے برسوں میں ایسا تیار ہوا کہ دنیا کے پردے پر کسی نے دوسرا آنکھوں دیکھا نہ کانوں سنا۔ تب دیوان نے جاکر راجہ کو خبر دی کہ مہاراج وہ مندر اب تیار ہوا آپ چل کر اسے دیکھیے ۔ راجہ نے ملاحظہ کیا تب برہمن دیکھکر اور ہنسکر کہنے لگا کہ اے راجہ ایسا گھر جو پاؤں تو بیٹھ یہاں پاتر نہ جاؤں یہ بات سنکر راجہ نے کچھ من میں سوچ نہ کیا ۔ گنگا جل اور تلسی دل لے کر گھر اس برہمن کو سنکلپ کر دیا وہ گھر پا کر برہمن ایسا آنند ہوا جیسے چکور رات کو پاوے ہے (سنگھاسن بتیسی ص۲۲)

للّولال نے بہاری لال کی ست سائی کی جو" لال چند ریکا" کے نام سے مشہور ہے۔ ہندی ہی میں شرح بھی لکھی ہے۔ یہ تالیف بہت ہی کم مشہور ہوئی[1]۔ للّولال نے اس کے علاوہ بھی متفرق طور پر نظم و نثر میں بہت کچھ کام کیا ہے۔ مظہر علی خاں ولا کی بیتال پچیسی میں بھی بڑی مدد دی۔ دوسرے ہندی ترجموں میں انہوں نے جو کچھ حصہ لیا ہے اس کا ذکر گذشتہ صفحات میں متفرق طور پر کیا جا چکا ہے۔

---

[1] تاریخ ادبیات ہندی از ایف۔ اے۔ کئی صفحہ ۸۹ ۱۲

مرزا محمد فطرت

مرزا محمد فطرت لکھنو کے رہنے والے اور بہت ہی گمنام اہل قلم ہیں، وہ شاعر بھی تھے اور فطرت تخلص کرتے تھے۔ شعرائے اُردو کے تذکروں میں صرف "طبقات الشعرائے ہند" مؤلفہ کریم الدین میں ان کا کچھ ذکر ملتا ہے مگر اس سے اُن کے حالات و تصانیف پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑتی۔ فطرت فورٹ ولیم کالج کے دوسرے منشیوں کی طرح نہایت ادنیٰ درجہ کے شاعر بلکہ یوں کہئے کہ معمولی موزوں طبع تھے ان کے حالات پر گہری تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ ٹھیک طور پر یہ بھی معلوم نہیں کہ فورٹ ولیم کالج میں کب ملازم ہوئے اور کب تک وہ اس سے متوسل رہے ان کا صرف ایک ہی کارنامہ مشہور اور ان کی یادگار ہے۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا مؤلفہ گریرسن سے معلوم ہوتا ہے انہوں نے ۱۸۰۱ء سے کچھ قبل جارج ہاڈلے کی قواعد اردو کا ایک مرمہ اڈیشن تیار کیا تھا کیونکہ یہ اڈیشن ۱۸۰۱ء میں لندن سے شایع ہوا۔ جارج ہاڈلے نے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان کے چند قواعد و اصول ضبط تحریر میں لاکر ایک کتاب لندن سے ۱۷۷۲ء میں شائع کی تھی۔ ہندوستان کی زبان سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے انگریزوں کو اکثر ایسی کتابوں کی ضرورت رہی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب کئی بار چھپی اور ہر اڈیشن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا گیا۔

قواعد زبان کے علاوہ ہندوستان کی معاشرت اور رسم و رواج پر کچھ ناقص معلومات بھی اس کتاب سے حاصل ہو سکتی تھی۔ اس زمانہ میں ایسی چیزوں کے متعلق مستند کتابیں اور ذرائع معلومات بالکل مفقود تھے اس لیے یہی ناقص معلومات اور رطب و یابس سے بھرے ہوئے بیانات قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے اور ہندوستان آنے والے نوجوان انگریز ان کو بہترین رہنمائے سفر سمجھ کر اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ فطرت نے ہاڈلے کی گرامر کا جو ایڈیشن مرتب کیا تھا وہ بھی کئی بار شائع ہوا اور نووارد انگریزوں کے مطالعہ میں رہا۔

اہل یورپ نے ہندوستان میں قدم رکھتے ہی اپنے زیر اثر ہندوستانیوں کو دین مسیحی سے واقف کرنے کی کوشش شروع کی اور ممالک یورپ کی تجارتی کمپنیوں کے قیام کے ساتھ پادری ہندوستان میں اپنی مقدس مذہبی کتاب "انجیل" کی اشاعت کرنے لگے۔ بائیبل کو اردو میں منتقل کرنے کی پہلی کوشش غالباً ۱۷۴۳ء میں شروع ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج میں ترجمہ کا کام شروع ہوتے ہی بائیبل کا اردو ترجمہ کرانے کی تجویز ہوئی اور مرزا محمد فطرت نے ول ہنٹر کی مدد سے یہ ترجمہ مرتب کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اصل یونانی سے ترجمہ ہوا ہے اس ترجمہ کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۵ء میں شائع ہوا تھا۔

فطرت کے ترجمہ کے بعد سرام پور کے پادریوں نے ہندی اور برج بھاشا میں بھی بائیبل کے دو تین ترجمے شائع کیے پھر ایک اور

مرمہ "ایڈیشن" برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اس ایڈیشن کی ترتیب بھی مرزا فطرت نے پادری مارٹن کی مدد سے کی تھی۔ چونکہ اس کا ترجمہ اہم تھا۔ اس لیے کالج کے چند دیگر منشیوں سے بھی اس کی نظرثانی کرائی گئی تھی۔ اس مرمہ ایڈیشن کی اشاعت ۱۸۱۹ء میں ہوئی۔ اس کے بعد سے متعدد ایڈیشن فارسی اور دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوئے آج کل "عہد جدید" کے جو نسخے رائج ہیں بعض الفاظ رد وبدل ہوئے ہیں مگر ترتیب عبارت فطرت ہی کی ہے۔ فطرت نے صرف عہد جدید کا ترجمہ کیا تھا عہد عتیق کا کسی اور نے کیا ہے۔ فطرت کا طرز بیان سادہ اور زبان سنجیدہ ہے۔

میر محی الدین فیض

میر محی الدین فیض کا حال کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ شعرائے دہلی کے مقامی تذکرے بھی ان کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے ان کی ایک تالیف دیکھی ہے اس سے جو حالات معلوم ہوئے ان کو "فہرست کتب خانہ شاہان اودھ" میں بیان کیا ہے! اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام میر محی الدین اور فیض تخلص تھا ان کے آبا واجداد سمرقند کے رہنے والے تھے مگر گیارہ بارہ نسلوں سے ان کا خاندان دہلی میں سکونت پذیر تھا وہ اہل دہلی میں بہت مشہور رہتے مگر تعجب ہے کہ دہلی کے کسی تذکرۂ شعرا میں ان کا ذکر نہیں میر محی الدین کی پیدائش اور تربیت بھی اسی شہر میں ہوئی۔ دہلی کی تباہی کے بعد ان کا خاندان غازی پور کو منتقل ہوا اور وہاں سکونت اختیار کی۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے تحصیل زبان اردو کے لیے مختلف شہروں کے دورے کیے اور ہر شہر کے شعراء و ادبا اور عام ادبی ذوق رکھنے والوں سے میل جول پیدا کیا۔ دورہ غازی پور میں فیض سے ان کی ملاقات ہوئی وہ ان کی شعر گوئی اور ادبی ذوق سے متاثر ہوئے اور اپنے ہمراہ کلکتہ لے گئے۔ ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایماسے فیض نے ۱۲۱۸ھ م ۱۸۰۳ء میں حضرت شیخ فرید الدین عطار کے پندنامہ کا اردو ترجمہ کیا۔

یہ ترجمہ منظوم ہے اور "چشمۂ فیض" کے نام سے موسوم ہے۔ کتب خانۂ شاہان اودھ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا۔ اس کی ابتدا اس بیت سے ہوتی ہے ؎

شکر کر اے دل خدائے پاک کا ہے جو ایمان بخش مشت خاک کا

فیض کا نہ تو کسی تذکرہ نویس نے تذکرہ کیا نہ ان کی یہ تالیف ہی کہیں دستیاب ہوئی۔ کتب خانۂ شاہان اودھ کے سوا کسی اور کتب خانہ میں اس کا قلمی نسخہ بھی محفوظ نہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب طبع بھی ہوئی یا نہیں ہمیں اس کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔

سید حمید الدین بہاری

فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کا تذکرہ نامکمل ہوگا اگر سید حمید الدین بہاری کا ذکر نہ کیا جائے اگرچہ ان کی تالیف بلحاظ ادبیات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ مگر اس لحاظ سے کہ وہ بھی ان محسنین نثر اردو کے زمرہ میں شامل ہیں ان کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر گل کرسٹ کو ہندوستانی معاشرت، تہذیب تمدن اور مسلمانوں کے عقاید، رسم ورواج سے عجیب دل بستگی تھی وہ اردو کے نہ صرف خود ولدادہ تھے بلکہ اس کو عام کرنے اور اپنے ہم وطنوں کو سکھانے کے خواہاں بھی تھے۔ اس معاملہ میں وہ مذہبی تعصب یا اجنبیت کا خیال کیے بغیر اہل یورپ کو ان سے واقف کرانے کے متمنی تھے۔ ان کی یہ اسپرٹ یقیناً ہندوستانیوں اور انگریزوں میں میل جول پیدا کرنے اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ حسن سلوک پر آمادہ کرنے والی تھی۔ انہوں نے نہ صرف ہندوستان اور اسلامی اخلاقیات، قصص وحکایات اور تاریخ وتذکرہ کی کتابیں ترجمہ کرا کر اہل یورپ کو اسلامی اخلاق وخیالات سے واقف کر دیا۔ بلکہ ان کی مقدس کتاب قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرا کر مسلمانوں کے اصلی عقائد سے بھی آشنا کرنا چاہا۔ اسی اسپرٹ کے

ماتحت انھوں نے سید حمید الدین بہاری سے ہندوستانی کھانوں کی کتاب "خوانِ الوان" مرتب کرائی۔

سید حمید الدین کے متعلق ہمیں کچھ معلومات حاصل نہ ہو سکی۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ صوبہ بہار کے باشندے تھے نہ تو وہ شاعر معلوم ہوتے ہیں نہ پُر نویس نثر نگار۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں ملازم تھے یا نہیں ان کی تالیف "خوانِ الوان" کا ایک نسخہ قلمی برٹش میوزیم میں ہے مسٹر بلوم ہارٹ کا بیان ہے کہ یہ کتاب ڈاکٹر گل کرسٹ کے ایما سے لکھی گئی ہے اور دیباچہ میں اس کا ذکر موجود ہے اس کا سنہ تالیف معلوم نہیں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۰۴ء میں یا اس کے قبل لکھی گئی کیونکہ اسی سال ڈاکٹر گل کرسٹ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن واپس ہوئے۔

فارسی میں طعام خانہ اور پکوان کے متعلق کئی ایک کتابیں موجود ہیں ہمیں "خوانِ الوان" کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ حمید الدین کی تصنیف ہے یا کسی فارسی کتاب کا ترجمہ۔ برٹش میوزیم کا نسخہ بیان کیا جاتا ہے کہ ڈھائی سو صفحات اور (۲۴) ابواب پر مشتمل ہے مضمون کتاب کی مناسبت سے باب کی جگہ خوان کا عنوان رکھا گیا ہے اُس وقت کے تمام مروجہ کھانوں اور مٹھائیوں کا تفصیلی بیان ہے ہر ایک کھانے کے اجزاء اور اس کے پکانے کے

طریقے وضاحت سے بیان کیئے گئے ہیں آخری باب میں مصطلحاتِ طعام خانہ
کی ایک فرہنگ ہے اور اس میں تمام الفاظِ متعلقہ کی ترتیب حروفِ تہجی
پر نہیں بلکہ ابواب کے موافق ہے غالباً سید حمید الدین کا یہی ایک
کارنامہ ہے اور انھوں نے اِس کے سوا کوئی اور تالیف یا ترجمہ نہیں کیا۔
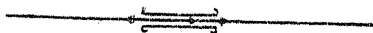
نظرِ بازگشت

صفحاتِ گزشتہ میں فورٹ ولیم کالج کے اربابِ قلم کے حالات اُن کی تصانیف و تراجم وغیرہ پر خود اُن کی تالیفات اور دیگر ذرائع سے جو معلومات دستیاب ہوئی پیش کی گئی ہے۔ ذیل میں بہ حیثیت مجموعی اس کالج کی اُردو نوازی اور اُردو نثر نویسی کی اساسی تحریک کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے۔

گزشتہ صفحات کے مطالعہ نے یہ واضح کر دیا ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور اُس کے ذریعہ اُردو نثر نویسی کی تحریک کا اصل مقصد اُن نو وارد انگریزوں کو ہندوستانیوں سے واقف اور اُن کے طور طریقوں سے آشنا کرکے ہندوستان میں حکمرانی کے قابل بنانا تھا جو انگلستان سے کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوکر یہاں آتے تھے اِس کالج کی بنیاد اہلِ ہند کے فائدہ پر نہیں رکھی گئی تھی بلکہ صرف کمپنی کی ضروریات کی تکمیل نے اس کو بالواسطہ اُردو لٹریچر کے لیے ممد و معاون بنا دیا۔

اِس کالج کی اصلی روح رواں ڈاکٹر گل کرسٹ تھے انھوں نے خود بھی جو کتابیں لکھیں اور اپنی سرپرستی و اعانت سے اردو کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں اُن کا ذکر اپنے اپنے موقع پر تفصیل سے آچکا ہے نیز اس کالج سے پہلے اُردو نثری ادب کی کیا حالت تھی اُس پر بھی ابتداءً کافی روشنی ڈالی

جا چکی ہے۔ اس کالج کی بانی اور سرپرست ایک ایسی قوم تھی جو خود بھی اپنا بہترین لٹریچر رکھتی ہے ممکن تھا کہ وہ اُردو میں اپنے لٹریچر کو منتقل کرنے کی کوشش کرتی مگر اس راہ میں اتنی مشکلات کا سامنا تھا کہ اس مہم کا سر کرنا امر محال نظر آتا ہے اہل ہند میں جو لوگ تصنیف وتالیف کی صلاحیت رکھتے تھے وہ انگریزی اور مغربی علوم سے قطعاً نا آشنا تھے۔ اور انگریزی زبان سے علم وفن کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنا ہرگز ان سے بن نہیں آسکتا تھا۔ علاوہ ازیں کالج کے قیام اور اس کی فوری ضروریات نے اس کا بھی بہت ہی کم موقع دیا کہ خود اُردو میں مستقل کتابیں لکھائی جائیں ان حالات میں اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ فارسی اور ہندی کی ایسی مقبول عام اور ٹھیٹ کتابوں کو اردو میں ترجمہ کرلیا جائے جن سے ایک طرف تو خود اہل ہند دلچسپی لیتے ہیں اور دوسری طرف اہل ہند کے مذاق و خیالات کے سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکے اس طرح نثر نویسی کی تحریک انگریزوں کی سرپرستی میں شروع ہوئی اگرچہ انگریزی کا اس پر بہت ہی خفیف اثر پڑا لیکن اردو زبان پر انگریزی اثر کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔

علوم وفنون کی کتابوں کو غیر زبانوں سے اپنی زبان میں منتقل کرنے کا طریقہ ہر قوم میں رائج رہا ہے ہر ایک قوم میں ترقی علم وفن کی پہلی منزل یہی ہے۔ یہ وہ قدم گاہ ہے جس پر چڑھے بغیر کوئی قوم علم وفن میں معراج کمال کو نہیں پہنچی۔ اہل عرب نے پہلے یونانیوں سے علوم وفنون اپنی زبان میں

منتقل کیے اور پھر خود ایسے صاحبِ کمال بن گئے کہ دوسری اقوام نے ان کی تحقیقات اور معلومات کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔ اہلِ یورپ اور بالخصوص اہلِ انگلستان جو آج دنیا بھر کے علوم و فنون کے خزانوں کے مالک ہیں وہ بھی اس راہ سے گذر چکے ہیں۔ انھوں نے ابتداءً عربوں اور دیگر ترقی یافتہ قوموں کی تصانیف کا ترجمہ اپنی زبانوں میں کر لیا۔ پھر اُن کے ذریعہ "دماغی آزادی" حاصل کر کے خود صاحبِ تصانیف بن گئے۔ غیر زبان کے ذخیرہ علم و ادب کو اپنی زبان میں منتقل کرنے کا شوق اس درجہ ترقی کر گیا ہے کہ اب تو یورپ کی ہر قوم مشرق اور بالخصوص ایرانیوں اور عربوں کی شاعری کو جس کا ترجمہ ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے اپنی زبان میں منتقل کرنے کی ساعی ہے ان کی زبانوں میں دیوان حافظ، مثنوی مولانائے روم، رباعیات عمر خیام، وغیرہ کے بھی ترجمے ہو چکے ہیں اور اب بھی یہ کام اسی شوق و ذوق سے جاری ہے جیسا کہ پہلے تھا۔

اردو زبان اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں اس میں بھی یہ طریقہ مروج رہا ہے دکن کے قدیم شعرا و مصنفین نے فارسی نظم و نثر کی کتابوں کے ترجمہ کی ابتدا کی اور اپنے محدود دائرہ میں ان کا جو کچھ بھی کارنامہ ہے اس کی پہلی منزل بھی ترجمہ ہی کی ہے۔ شمالی ہند اور عام اردو دنیا میں بھی لٹریچر کی پیدائش اسی عام سنت پر ہوئی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد اکثر مصنفین نے بطورِ خود اور علی گڈھ کی سائنٹفک سوسائٹی، دیگر ملکی

اور علمی انجمنوں اور جامعۂ عثمانیہ نے اجتماعی طور پر یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔
آج اُردو کی دنیا میں جو اہلِ قلم مستقل تصانیف کے مالک ہیں وہ سب
اِسی خرمن کے خوشہ چین اور اِسی دبستان کے تربیت یافتہ ہیں اور
اُردو میں مستقل کتابیں لکھنے کا جو کچھ چرچا ہے اُس کی بنیاد اِسی ترجمہ کی
منزل میں ملتی ہے۔ اِس خصوص میں فورٹ ولیم کالج کو اولیت کا نہیں تو
اساسی محرک ہونے کا فخر ضرور حاصل ہے۔ دکن میں ترجمہ کے ذریعہ اردو نثری
ادب کی پیداوار کی تحریک ایسی سرسبز اور عام نہیں ہوئی جیسی کہ اِس
کالج کے ذریعہ ہوگئی۔ اِس کے بعد ہی ہندوستان میں انگریزوں کا تسلط
بھی بالواسطہ اس تحریک کو عام کرنے کا باعث ہوا اور اردو لٹریچر میں
بہت جلد کتب نثر کا کافی ذخیرہ پیدا ہوگیا۔

شمالی ہند کے مصنفین میں کسی نے ڈاکٹر گلکرسٹ کی تحریک سے قبل بطورِ خود
نثر نویسی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ وہ اُردو زبان میں ماہر اور محاورہ
و روزمرہ کے دھنی تھے۔ ان میں نثر نویسی کی صلاحیت موجود تھی صرف
مناسب رہنمائی کی ضرورت تھی۔ یہ رہنمائی ڈاکٹر گلکرسٹ نے کی
اور بہت جلد اُن کو نثر نویسی میں ممتاز حیثیت دلادی۔ اگرچہ ڈاکٹر
گلکرسٹ کی مساعی کا دائرۂ عمل صرف کالج کے اربابِ قلم تک محدود
تھا اور اُنھوں نے عام طور پر نثر نویسی کی وسیع رہنمائی اور سرپرستی
نہیں کی مگر اُن کی تحریک ایسے مناسب موقع پر شروع ہوئی تھی کہ
اُس کو بہت ہی قلیل عرصہ میں رواجِ عام حاصل ہوگیا سلطنتِ مغلیہ کے

اقتدار میں زوال آگیا تھا سرکاری زبان کی حیثیت سے بھی فارسی کی وہ منزلت باقی نہیں رہی تھی جو مسلمانوں کے زمانۂ عروج و اقبال میں تھی۔ ہندوستان کی دوسری قومیں اب فارسی کی طرف اُس شوق اور رغبت سے متوجہ نہیں رہی تھیں جیسا کہ اکبر اور شاہ جہاں کے زمانہ میں تھیں۔

بظاہر فورٹ ولیم کالج کی کتابوں میں کوئی اعلیٰ علمی تصنیف یا تالیف نظر نہیں آتی زیادہ تر کتابیں قصص و حکایات کی ہیں اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس دور کی نثری پیداوار افسانوی ہے، مگر یہ حقیقت سے دور ہے اول تو نظمائے کمپنی نے یہ کالج جن شروط و قیود سے قایم کیا تھا اس کی وجہ سے اس کا دائرہ نہایت تنگ ہو گیا تھا۔ لارڈ ویلزلی اور گل کرسٹ تو اس کو حقیقت میں ایک اردو یونیورسٹی بنانے کے خواہشمند تھے انھوں نے مشرقی و مغربی السنہ کے علاوہ اعلیٰ علوم مثلاً ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات وغیرہ کے شعبے قایم کرنے کی کوشش کی مگر نظمائے کمپنی نے اُن کی ایک نہ سنی اور صرف ملکی زبانوں کی ایک تعلیم گاہ قائم کرنے کی اجازت دی اس کے علاوہ اُس زمانہ میں عام ہندوستانیوں کا علمی مذاق کسی قدر بگڑ چکا تھا تاریخ سے بہ حیثیت فنِ تاریخ نہیں بلکہ بہ لحاظِ قصہ دلچسپی باقی تھی۔ عام طور پر قصص و حکایات اور وہ بھی فوق العادت اور فوق الفطرت قصے پسند کیے جاتے تھے اُس زمانہ میں فارسی کا بھی سب سے زیادہ مقبول لٹریچر انھی قصہ کہانیوں کی کتابوں پر مشتمل تھا اخلاقیات اور فکر و نظر پر مستقل اور ٹھیٹ علمی کتابوں سے عوام کو کسی طرح کی دلچسپی

نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے قدما نے ان بلند مضامین کو ہمیشہ قصہ کہانی کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ مشرق کے افسانوی ادب میں اخلاقی عنصر ہی سب سے زیادہ ہے اور اکثر صورتوں میں قصے کی تان کسی نہ کسی نصیحت اور عبرت کی بات پر ٹوٹتی ہے۔ خاص و عام قصہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے کتاب پڑھتے ہیں تو خود بخود اس کی اخلاقی تعلیم سے متاثر ہو جاتے ہیں۔

ہندوستانیوں کے ماحول اُن کے رسم و رواج اور طور طریقوں کے معلوم کرنے کے لیے ان کا ایسا ہی لٹریچر مطالعہ کرنا ضروری خیال کیا گیا۔ یہی کتابیں ان کے فکر و ذکر کی آئینہ تھیں۔ یہ سچ ہے کہ فورٹ ولیم کالج نے جو کتابیں اردو میں ترجمہ کرائیں اُن میں زیادہ تعداد ان ہی کتابوں کی ہے مگر اس کی مساعی کا دائرہ اس قدر تنگ داماں نہیں ہے تاریخ و تذکرہ کا بھی ایک معقول حصہ اس کالج کی طرف سے مرتب ہوا ہے۔ شیر علی افسوس کی آرائش محفل، حیدری کی تاریخ نادری، مظہر علی خاں ولا کی تاریخ شیر شاہی اور حسینی کی تاریخ آسام نہایت معتبر اور مستند تاریخیں ہیں۔ مرزا علی لطف کے تذکرۂ گلشن ہند اور یہاں کے دیگر تذکروں میں شعرائے اُردو کے قدیم تذکروں کی بہ نسبت واقعات و حالات کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ بعض خالص علمی اور مذہبی کتابیں مثلاً اخلاق جلالی، ہدایت الاسلام، تنبیہ الغافلین وغیرہ بھی ان مولفین کی یادگار ہیں قواعد زبان اور صرف و نحو پر اس زمانہ میں زیادہ تر انگریزی رسالے

لکھے گئے ان کے مصنفین خود اہل یورپ تھے جو اپنی زبان میں اپنے ہم قوموں کو اُردو صرف و نحو کے اصول آسانی سے سکھا سکتے تھے تاہم کالج کے مصنفوں نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ بہادر علی حسینی کا خلاصہ قواعد گل کرسٹ اور مولوی امانت اللہ کی "صرف اُردو" وغیرہ ابتدائی رسالے ان کی قابل قدر کوششیں ہیں۔

ابھی اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اُس عہد میں پبلک کا عام مذاق علمی کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ علم و فن سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ عام خاص لوگ قصص و حکایات کے دلدادہ تھے اُس عہد کی قصہ پسندی نے ان مولفین کے ٹھوس علمی ثمرات کو بارور ہونے نہ دیا۔ اور اُن کے کارناموں میں قصہ کہانیوں ہی کی زیادہ قدر کی گئی۔ کالج کی مطبوعات میں سب سے زیادہ مقبول کتابیں قصے کہانیوں کی ہیں ان میں سے اکثر کے اس وقت تک پندرہ پندرہ بیس بیس اڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ خالص علمی اور تاریخی کتابوں کو بہت ہی کم مرتبہ اشاعت نصیب ہوئی۔ بعض تو صرف ایک مرتبہ چھپ کر رہ گئیں اور بعض کے صرف قلمی نسخے رہ گئے جو اہل یورپ ہی کی علم دوستی سے برٹش میوزیم اور انڈیا آفس میں محفوظ ہیں یا ہندوستان کے غیر معروف کتب خانوں اور لوگوں کے خانگی ذخیروں میں ملتے ہیں۔

اس کالج کی اصلی سرگرمی کا زمانہ ڈاکٹر گل کرسٹ کا عہدۂ صدارت تھا اس دور میں جو فورٹ ولیم کا دورِ اول قرار دیا جا سکتا ہے نہایت گرانقدر کتابیں ترجمہ ہوئیں ان کے انگلستان

بعد اُن کے جانشینوں نے اُسی سرگرمی اور جوش سے زبان اُردو
ںکی جس کی وجہ سے اُن کا لگایا ہوا پودا روز بہ روز بڑھنے
بڑے طور پر پھلنے پھولنے اور بہترین ثمرات دینے کے مواقع
ں تحریک کے بعد اور سر سید احمد خاں کی مساعی شروع
جو کتابیں تصنیف و تالیف ہوئیں ان میں زیادہ تر قصّے اور
م مذہبی رسائل ہیں۔ خالص علمی عنوانات پر کوئی گرانقدر
ا ہوئیں۔
ن مذہبی کتابوں کی تصنیف و تالیف کا عام شوق بھی بالواسطہ
ریک کا مرہونِ منّت ہے۔ کالج کی طرف سے قرآن مجید اور
کے ترجموں کی کوشش ہوئی اہل یورپ اُردو زبان کی تحصیل
انوں کے مذہبی معتقدات و خیالات سے واقف ہونے لگے
لغین نے اپنے مذہب کی تبلیغ و تلقین کے لیے زیادہ تر اسی
رکیا۔ اسلام پر اُن کے حملوں اور اعتراضوں کے جواب میں
ی یہی زبان اختیار کرنی پڑی خود مسلمانوں کے آپس میں
لد کے مناظرے اسی زبان میں ہونے لگے اسی طرح مناظرات
خاصا ادب مرتب ہو گیا۔ گو فورٹ ولیم کالج نے عیسائی اور
مناظرہ کا کوئی دروازہ نہیں کھولا اور نہ اُس نے اردو میں
یں لکھوائیں مگر اُس کی تحریک نثر نویسی اور اردو زبان کی
دونوں مذاہب کے مناظرین کو اسی زبان کی طرف مائل کر دیا۔

اِس کالج کی کتابیں اُردو کے قدیم اسلوب بیان میں عظیم الشان انقلاب کا باعث ہوئیں انھوں نے صفائی و سادگی کی مشترکہ خصوصیت کے ساتھ آئندہ مصنفین کے آگے مختلف اسالیب بیان کے دروازے کھول دیئے اس سے قبل کی اُردو کی جو متفرق تحریرات موجود ہیں اُن کا طرز بیان قدامت اور کہنگی سے قطع نظر نہایت مغلق اور پیچیدہ ہے۔ شمالی ہند کی ابتدائی نثر نویسی کے نمونے بالکل فارسی کی مرصّع اور مقفّیٰ طرز پر مبنی ہیں ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ انھیں بہ مشکل اردو عبارت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے فعل اور حروفِ ربط وغیرہ چند الفاظ سے قطع نظر کرلی جائے تو ساری عبارت فارسی رہ جائے گی۔ اس تحریک سے قبل درحقیقت اردو کا اپنا کوئی مستقل اسلوب ہی نہیں تھا جو کچھ لکھا گیا وہ محض فارسی کی بھونڈی تقلید تھی اِس کالج کے اربابِ قلم نے انگریزی عاملین کے ماتحت کام کیا تھا اور ان کی تصنیف کی سب سے بڑی غایت نووارد انگریزوں کو اُردو سکھانی تھی اس لیے انھوں نے سادگی وصفائی کا خاص طور پر لحاظ رکھا اس کالج کے تقریباً تمام مصنّفین ایک دو مستثنیٰ مثالوں کے سوا سادہ نثر نویسی کے علم بردار ہیں۔ سادگی کی مشترکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایسے گوناگوں دلآویز اسالیب پیش کرتے ہیں جن پر اردو کے تمام اسالیبِ بیان کی بنیاد ہے اگر ایک طرف میر امن اور شیر علی افسوس دہلی کے روزمرہ اور محاوروں پر اپنی کتابوں کی بنیاد رکھتے ہیں تو دوسری طرف مولوی اکرام علی، حیدر بخش حیدری وغیرہ کی زبان سنجیدہ اور

علمی ہونے کے علاوہ مقامی اثرات سے پاک ہے اگرچہ ان کی کتابوں کو تالیف
ہوئے سوا سو سال سے زیادہ عرصہ گذر گیا مگر اب بھی ان میں بہت سی
کتابیں عام طور پر پڑھی جاتی ہیں زبان کے کافی ارتقاء اور تغیر و تبدل
کے بعد بھی اُن کی زبان فرسودہ اور دور از کار نہیں بنی اس نے اپنی
دلاویزی سے فارسیت کے عالمگیر اثر کے باوجود سلیم الطبع اہل قلم کو اپنا
گرویدہ بنا لیا۔

ابھی تک اُردو نثر نویسوں کے اکثر کارنامے تاریکی میں ہیں اور
غدر سے قبل کے نثر نویسوں میں بہت ہی کم مشہور ہیں اس وجہ سے قطعی
طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ مصنفین فورٹ ولیم کالج کے اسالیب بیان نے
ان پر کیا اثر ڈالا اور اس دور کے کون کون مصنفین ان اسالیب کے
پیرو ہیں ۔موجودہ معلومات اس بارہ میں نہایت ناکافی ہے اس سے صرف
اس قدر ثابت ہے کہ عوام الناس میں ان اسالیب کو بے حد پسندیدگی
حاصل ہو گئی تھی دہلی کے مصنفین میں ان اسالیب کی تقلید کا ذوق زیادہ
پایا جاتا ہے اور اہل لکھنؤ میں کم۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مصنفین پر
فارسیت کا رنگ بہت زیادہ چھایا ہوا تھا اور بالخصوص مسلمان اس
اثر کو دور کرنا پسند نہیں کرتے تھے انھیں سادہ نگاری اختیار کرنے میں
پس و پیش ہوتا تھا خود سر سید احمد خاں جو فطرتاً سادہ نگاری کی طرف
مائل تھے اپنی کتاب ''آثار الصنادید'' کے پہلے اڈیشن کے وقت اس کو اپنا
مرصع نگار سے درست کرواتے ہیں کیونکہ اپنے سادہ طرز بیان میں اس کتاب کے

مقبول عام نہ ہونے کا اندیشہ تھا۔ تاہم ان اسالیب بیان نے سلامتی پسند طبائع پر نہایت اچھا اثر کیا۔ مرزا غالب کے خطوط اور اُن کے معاصرین کی سادہ نثر نویسی بھی ان سے متاثر نظر آتی ہے۔ غالباً خطوط کی مقبولیت کے اسباب میں غالب کی طرز تحریر کی خصوصیات شوخی و ظرافت وغیرہ کے علاوہ سلیم الطبع افراد میں سادہ عبارتوں کی پسندیدگی بھی ہے۔ میر امن حیدر بخش حیدری اور اُن کے ہم کاروں کے اسالیب کی پختہ کاری نے اگر اپنے مابعد قریب کے زمانہ پر نہیں تو بعید پر زیادہ پائدار اثر ڈالا۔ اُردو کے کئی متاخر مصنفوں کے اسالیب کی بنیاد انہی کے اسلوبوں پر نظر آتی ہے۔

اس کالج کی تحریک سے نہ صرف اُردو کا نثری لٹریچر پیدا ہوا بلکہ اس کی عام اشاعت کے بھی کامیاب ذرائع مہیا ہوگئے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پہلے طباعت کا انتظام ہی نہیں تھا اس عہد میں چند پتھر کے چھاپہ خانے قائم ہوئے کلکتہ میں کالج نے سب سے پہلے ٹائپ پریس قائم کیا اور اس کے مصنفین کی کتابیں اس مطبع میں چھپنے لگیں۔ طباعت کی سہولت نے بہت ہی قلیل عرصہ میں ان کتابوں کو سارے ہندوستان میں شایع کردیا اور خاص و عام ان کا مطالعہ کرنے لگے۔ موجودہ زمانہ میں جبکہ ہماری ضروریات بہت زیادہ ہوگئی ہیں لیتھو کی چھپائی سے عام طور پر بیزاری ظاہر کی جارہی ہے اور ہر شخص ٹائپ پریس کے رواج کا خواہشمند ہے دار الطبع حیدرآباد بڑی کوشش سے اُردو ٹائپ بنایا ہے اور سرکار عالی کا "جریدۂ اعلامیہ" بھی ٹائپ کے حروف میں شایع ہونے لگا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کا

ٹائپ پریس اس ترقی کی پہلی سیڑھی ہے اگرچہ دار الطبع کے تیار کردہ حروف اس زمانہ کے حروف سے کسی قدر سڈول اور خوشنما ہیں لیکن اس سے کچھ زیادہ شاندار ترقی اس باب میں حاصل نہیں ہوئی وہ ٹائپ بھی اپنی جگہ نہایت اچھا تھا اگرچہ اُس میں نستعلیق خط کی خوبصورتی ہرگز نہیں پائی جاتی لیکن اگر اُس وقت سے برابر ترقی دی جاتی تو اس وقت تک یقیناً نہایت خوشنما ٹائپ تیار ہوجاتا۔

فورٹ ولیم کالج نے اُردو شاعری کی براہِ راست کوئی خدمت نہیں کی اس کی بدولت اُردو شاعری میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی جیسی کہ کرنل ہال رائڈ اور پنجاب بک ڈپو کے ذریعہ لاہور میں عمل میں آئی۔ اس کا واحد شاندار کارنامہ نثر اُردو کی خدمت ہے تاہم اس سے اُردو شاعری کو بھی متمتع ہونے کا موقعہ ملا اس کالج کے تقریباً تمام مصنفین شعر گوئی کا چسکا رکھتے تھے مگر اس میں اُن کو کوئی ممتاز درجہ حاصل نہیں ایک دو بلند پایہ شاعروں سے قطع نظر تقریباً تمام مصنف معمولی درجہ کے ناظم تھے ان کے نظمیہ کارنامے کسی قدر و منزلت کے مستحق نہیں۔ اِس کے باوجود بھی کالج نے اُن کی سرپرستی کی اور اُن کے شاعرانہ کمال کو استحقاق سے زیادہ وقعت دی۔ ان کے شاعرانہ ذوق کی تکمیل کے لیے کالج کی جانب سے ہر سال عظیم الشان پیمانہ پر ایک مشاعرہ کیا جاتا تھا اور اچھے شاعروں کا کلام گرانقدر انعام دیکر خرید لیا جاتا تھا۔ کالج کی طرف سے اُن کی نظموں کی اشاعت بھی کی گئی اِس کے علاوہ اِس خصوص میں فورٹ ولیم کالج کی نمایاں اور قابل تعریف خدمت شعرائے اُردو کے دیوانوں کے پاکیزہ انتخابات شائع کرنا ہے میر تقی مرزا سودا اور میر سوز وغیرہ اساتذۂ اردو کے کلام کے

جامع انتخابات کالج کے خوش مذاق مصنّفین سے کرائے گئے اور انھیں صحت واہتمام کے ساتھ شایع کیا گیا۔ اُن انتخابات سے جو ہماری نظر سے گذرے ہیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں شاعر کے کلام کی اصلی روح لے لی گئی ہے اور رطب ویابس کو خارج کر دیا گیا ہے ادبیاتِ عالیہ کے مطالعہ میں انتخابات نہایت ضروری ہیں ہر شاعر کا کلام ابتدا سے لیکر انتہا تک ایک ہی معیار کا اور قابل مطالعہ نہیں ہوتا کسی زبان کی شاعری کا سارا ذخیرہ سب کا سب مطالعہ کا مستحق نہیں اور نہ کوئی اس کا کامل مطالعہ کر سکتا ہے۔ خوش سلیقہ انتخاب ہی ایسا واحد طریقہ ہے جس کے ذریعہ بیجا وقت ضائع کیے بغیر شعرا کا بہترین کلام عام مطالعہ میں آجاتا ہے اور شاعر کی ذہنیت، پیام، خیالات، زبان، خصوصیات ہر ایک چیز اُس سے معلوم ہو جاتی ہے اُردو شاعری میں سے ایسی کارآمد باتوں کو نکال لینے کی طرف بہت کم توجہ کیگئی۔ نولکشور پریس کی بدولت بہت سے اُردو شاعروں کے ضخیم دیوان تو چھپ کر شایع ہو چکے ہیں مگر کوئی اُن کے مطالعہ سے معقول استفادہ نہیں کر سکتا۔ اشعار کی بڑی تعداد غلط ہے پھر ہر قسم کا کلام ہے جس کا مطالعہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" کا مصداق ہے اگرچہ فورٹ ولیم کالج کے بعد بھی انتخابات کی اشاعت میں کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کی گئی ہے اور اِس وقت شعرائے اُردو کے انتخابات کا تھوڑا ساذخیرہ موجود ہے لیکن انتخابات معیاری نہیں اکثر صورتوں میں وہی رطب ویابس کی بھرمار ہے اور انتخابات کا اصل منشا پورا نہیں ہوتا۔

اِس کالج نے ہندی زبان کی بھی معقول سرپرستی کی ہے موجودہ اعلیٰ

یا معیاری ہندی کی بنیاد اسی کی سرپرستی میں رکھی گئی ہے کالج کے ہندی مصنف جن میں للولال کوی سب سے زیادہ ممتاز ہیں موجودہ معیاری ہندی کے بانی ہیں۔ ڈاکٹر گل کرسٹ نے نہ صرف فارسی بلکہ ہندی کی بھی مقبول اور مشہور کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا۔ اور حقیقی علمی فیاضی سے کام لے کر اردو کو کافی وسیع کر دیا ہے ہندی زبان کے ساتھ ان کی سرپرستی ایسی وسیع نہیں رہی جیسی کہ اردو کے ساتھ رہی ہے۔ لیکن یہ کسی تنگ نظری کا نتیجہ نہیں اس زمانہ میں ہندی زبان بلحاظ علم و ادب کچھ بھی نہیں تھی اس کی مختلف شاخیں مشرقی ہندی، مغربی ہندی، راجستانی، بہاری وغیرہ ہیں پھر ان کی اور شاخیں اور بولیاں ہیں جن میں سارا ہندی لٹریچر منتشر ہے کوئی ایک شاخ شاعری اور اصناف ادب کے لحاظ سے ایسی وقیع و وسیع نہیں تھی کہ اس کی سرپرستی کرنے اس کا ذخیرۂ کتب بڑھایا جاتا ہندی لٹریچر کا عہد زرین مغلیہ تسلط کا زمانہ اور بالخصوص اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا عہد حکومت ہے مگر اس دور میں زیادہ تر "اردو شاعری" پائی جاتی ہے علم و ادب کی اعلیٰ چیزیں بالکل مفقود تھیں اس دور کے بعد اگر کچھ حقیقی اضافہ ہوا تو اس کالج کی سرپرستی سے۔ متاخرین اور حالیہ ہندی مصنفین کی ساری علمی مساعی کی بنیاد اسی کالج کی سرپرستی میں پڑی اور اس کی ساری موجودہ ترقیوں کا نقطہ آغاز یہیں ملتا ہے۔

اشاریہ

نام	صفحہ